جلد ۱۰۱ مئی ۱۹۸۴ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

تفہیم القرآن

کے

سپیشل سیٹ عام سیٹ، جلد اوّل تا ششم الگ الگ

اور متفرق اجزاء و سورتیں

نیز ادارہ کی جملہ کتب اس وقت سٹاک میں موجود ہیں

تاجر حضرات فوری طور پر رجوع فرمائیں — پیشگی رقم ارسال کرنے والے حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔

جنرل منیجر

ادارۂ ترجمان القرآن لمیٹڈ

دربار مارکیٹ۔ لاہور

فہرست مضامین

عدد ۳	مئی ۱۹۸۴ء مطابق شعبان ۱۴۰۴ھ	جلد ۱۰۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ تیئس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایس فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

مسلم ہونے اور تحریکِ اسلامی کا علمبردار اور دعوتِ حق کا گواہ بننے کے لیے شرطِ لازم یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہی آدمی خدائے واحد کے سوا سارے آلہہ و طاغوت کا انکار کر دے۔ سب سے مشکل کام نفس کے اِلٰہ کا انکار ہے۔ پھر بیوی بچوں اور خاندان کے الٰہوں کا انکار ہے۔ پھر ماحول کی رسمیات کے پورے مذہبِ اسراف و بدعت سے انکار ہے۔ جو شخص راہِ حق میں خلوص و صدقِ دل سے نکلے اُس کے لیے راستہ یہی ہے کہ وہ مختلف الٰہوں کی لازم کردہ شریعتِ رسوم سے بغاوت کے لیے تیار ہو، ورنہ جسے ہر طرف نباہ کے رکھنی ہو، اس کے لیے دین کی سربلندی کا کام کرنے والوں میں آگھسنا بعد میں خود اُسے پریشان کرے گا۔

چنانچہ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کا آغاز ہی اصلاحِ رسوم اور انسدادِ بدعات سے کیا تھا۔ اسی طرح مولینا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس میدان میں بڑا کام کیا۔ آج بھی جس کسی کو دین کی خدمت کرنی ہے، اُسے رسوم و بدعات کی زنجیریں توڑنی ہوں گی اور اس کام کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

ہم پہلے ہمارے دورِ بادشاہت نے باہر کے اثرات لاکے ڈالے۔ پھر ہندوانہ رسم و رواج ہماری تقاریب میں گھس گئے اور اب مغربی معاشرہ و تمدن کے اثرات راستہ بنا رہے ہیں۔ تمام غلط بیرونی اثرات سے نکلنے کے لیے ایک مہم ضروری ہے اور شاید شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے پہلے اصلاحی کام ہونا چاہیے۔

اس معاملے میں معاشرے کے سامنے سر جھکا دینے کے بعد پھر آپ تبلیغی جماعت کی طرح کا کام

کر سکتے ہیں، طاغوتوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اقامتِ دین کا بھرپور کام نہیں کر سکتے۔

محترم قاضی حسین احمد قیم (کالعدم جماعت اسلامی) نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں شادی بیاہ کو فضولیات سے پاک کرنے کے جو اصولی دعوت کارکنوں کو دی ہے، اُس کا علم ہوتے ہی مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں جہاں ایک طرف شادیوں اور ولیموں کے نئے پُرشکوہ ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اتنا دلگیر تھا کہ کئی بار خیال کیا کہ کسی شادی میں سرے سے شرکت ہی نہ کی جائے[1]۔ اور دوسری طرف جب میرے دل میں تحریک کے بعد ۔ دور کی یہ اجتماعی اُمنگ جاگ اُٹھی کہ جس طرح دوسرے معاملات میں ہمیں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے گندے سمندر سے ایک نئے پاکیزہ جزیرے کو اُبھارنا ہے، اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں بھی نئے طریقے اختیار اور رائج کرنے ہیں۔ جس دینی تحریک نے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا ہے، آئندہ وہی ہمارے نئے تعلقات اور رسومات کی بنیادیں فراہم کرے گی۔ اس سلسلے میں کچھ کام بھی ہوا، مگر پھر ماحول نے وہ وہ چکر دیئے کہ سب کچھ فراموش ہو گیا۔ اور ہم نے معاشرے میں اپنی نئی مقام پیدا کرنے کے بجائے رسمیات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ سو میرے لیے قاضی صاحب کا ایک ذرا سا جملہ سوئے ہوئے احساسات کو جگانے کا بہانہ بن گیا۔ لطیفہ کے طور پر کہنا ہو تو کہہ لیجیے کہ "قاضی با قاضی می سازد"۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب

---

[1] ہمارے حلقے سے وابستہ لوگوں نے ایسی بھی مثالیں قائم کی ہیں کہ دولہا صاحب مردانہ طلائی زیورات سے مرصع ہو کر تشریف لائے اور لڑکی والوں کے متوسط الحال سے خاندان سے گن گن کر اسبابِ جدید کے مطالبے پورے کرائے گئے۔ ایسے تماشے بھی دیکھے کہ لڑکی والوں کے ہاں کسی بند کوٹھڑی میں محض چھوٹی ڈھولک بج رہی تھی، مگر جب بارات کی آمد کا وقت ہوا تو لڑکیوں نے دوڑ بھاگ کر اُسے چھپانے کی کوشش کی کہ اسلامی طرز کی بارات والے کیا رائے قائم کریں گے، مگر ستم یہ ہوا کہ اس "اسلامی بارات" میں سب سے پیش پیش بے پردہ عورتوں کی ایک ٹولی نکلی اور اُن کی سرغنہ صاحبہ نے آدپہنچ کر زور شور سے خود گانے بجانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (ن ۔ ص ۔)

کو بہت سے تحسینی خطوط موصول ہوئے اور کارکنوں میں نہایت اچھا احساس اُبھرا۔[1]

میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بالائی مشاورت میں اپنے اُصول و معیارِ دین کے مطابق مگر اعتدال پسندانہ طریق سے طے کر لینے چاہئیں۔ اور پھر اُمید کرنی چاہیے کہ ہمارا کوئی رفیق یا حامی ان کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔

آج کل جتنی چیزیں میں نے غلط شکل میں ہوتی دیکھیں اُن سب کا عذر بڑے بڑے "اساطین" تک نے یہ بیان کیا کہ کیا کریں اب لڑکے نہیں مانتے، یا بیوی یا برادری نہیں راضی ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگ نہ اپنے گھر کے لیے کبھی قوّام (لیڈر) بن سکے رہے، نہ انہوں نے بیوی بچوں کی بائیس تئیس برس میں کوئی تربیت کی اور نہ اپنی برادری پر اپنی اخلاقی فوقیت کا کوئی سکّہ بٹھایا۔ دوسرے معنوں میں باہر تو وعظ کہے جاتے رہے، مگر اندر شیطان بدعات و رسمیات کا محاذ بناتا رہا۔ ہمارے دوست اپنے گھروں کے اندر اپنے نظریات و مقاصد کے خلاف ایسے تباہ کن محاذ بنتے اور پھیلتے ہوئے دیکھتے رہے اور کبھی انہیں احساس نہ ہوا کہ بہت سے آلہہ و طواغیت اُن کو اُن کے اپنے گھر میں شکست دینے کے سامان کر رہے ہیں۔ اور آج تو شیطانِ مغربیت کی بنیادی پالیسی ہی یہ ہے کہ عورتوں کو ہپناٹائز کر کے اور بچوں کو تفریحات کی ٹافیاں کھلا کر اور جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو فحاشی و لذتیت کی ہیروئن کا عادی بنا کر مسلم گھروں کے اُن قلعوں کو توڑ دیا جائے جن کے فراہم کردہ تحفظ کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے آداب و شعائر کسی نہ کسی طرح اب تک زندہ چلے آ رہے ہیں۔ نیز گھروں میں بزرگوں، خصوصاً اسلامیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ماؤں، دادیوں، نانیوں اور پھوپھیوں کو اس حد تک بے بس کر دیا جائے کہ وہ نصیحت کرنا تو کجا، زندگی کے مشکل مرحلوں کو نوجوانوں

۱؎ مجھے اس تحریر کو لکھنے کے دوران میں یہ معلوم کر کے از حد مسرت ہوئی کہ ہمارے رفقاء نے اصلاح احوال کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو اپنی تجاویز مرتب کر کے دے گی۔ آخری فیصلہ جو کچھ ہوگا، میں اس کا ساتھ دوں گا۔ مگر اس وقت تو میں یہ تحریر بڑی حد تک لکھ چکا ہوں، اور میرے خیال میں کوئی بات خلافِ اسلام اس میں نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ تغیرات و توضیحات میں دوسروں کی رائیں مجھ سے بہتر ہوں۔ (ن ص)

کے سہارے طے کرنے کے لیے کچھ غلط حرکات کو دیکھ کر خاموش بھی رہیں اور طنز و تمسخر بھی برداشت کریں۔

میرے سامنے سب پہلے پہل کراچی کی بعض دولت مند تاجر برادریوں کی طرف سے شادی بیاہ کے لیے طے شدہ ضابطے آئے اور ان ضابطوں پر عمل بھی ہوتے دیکھا اور سُنا تو مجھے صدمہ ہوا کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا اور زیادہ معیاری اور بہتر طور پہ کرنے کا تھا اس میں ایسے دوسرے لوگ بازی لے گئے جو دنیادار کہلاتے ہیں۔

اپنے ہاں بھی خال خال مثالیں ایسی اُبھریں کہ انہیں دیکھ کر دل سے بے اختیار دعائیں نکلیں، مگر ایک تو وہ شاذ ہیں، دوسرے اُن کی خوبی کو اس پر محمول کیا گیا کہ غریب لوگ ہیں، حالات بہتر ہوتے تو یہ بھی سب کچھ کر گزرتے۔ مگر میں اپنے بعض دوستوں اور رفیقوں کو جانتا ہوں کہ وہ اصولاً اور مسلکاً ایک خاص طرز پر سوچنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہمارا سرمایۂ افتخار اور ہمارے لیے نمونہ ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں منزل اوّل رشتے کی تلاش ہوتی ہے۔ لڑکا اگر پیسے والا ہو (اور مشرق وسطیٰ میں تیل سونا رکھنے والے ممالک نے کتنے ہی ان پڑھ اور بدصورت لوگوں کو دولت مند بنا دیا ہے) تو ماں بہنیں چراغ لے کر کسی ایسی چاند سے مکھڑے[1] کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں جس کے پیچھے پیچھے دولت کی ندی بھی بہتی چلی آئے۔ کہیں ان پڑھ لڑکوں سے ایم اے پاس لڑکیوں کا

---

[1] اس مادہ پرست اور جسم پرست اور چہرہ پرست معاشرے میں سارا حسن بال اور کھال اور خد و خال تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ کتنے ہی سادہ اور سانولے چہروں کے پیچھے خوش اخلاقی، وفاشعاری، طاعت گزاری اور حفظِ عصمت و ناموس کا ایک خزانۂ حسن مخفی ہوتا ہے۔ ایک حسن نگاہوں کے لیے عارضی سامانِ فریب ہوتا ہے، دوسرا حسن ساری زندگی کو پُرنور بنا دیتا ہے، مگر بگڑے ہوئے سطحی ذوقِ حسن کو تبدیل کون کرے۔

جوڑ لگا دیا جاتا ہے، کہیں بدصورت نوجوانوں سے انتہائی نرم و نازک لڑکیاں وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ پھر یہ ستم بھی ہوتا ہے کہ پینتالیس سال کا مرد کسی ۱۸ سال کی لڑکی کو شکار کر لے جاتا ہے اسی طرح لڑکی والے بھی یہ دیکھیں گے کہ لڑکے کے پاس پیسہ وافر ہے۔ ڈاکٹری، انجینری، اعلیٰ سرکاری عہدہ یا کوئی بڑا بزنس ہے۔ الگ گھر ہے، ساس نندوں سے تو سابقہ نہیں پڑے گا وغیرہ۔

حالانکہ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی لڑکا یا لڑکی یا اُن کے گھرانے تحریکی لحاظ سے یا کم سے کم دینداری اور پردہ داری کے لحاظ سے کیسے ہیں۔ باقی ساری چیزیں علی الترتیب بعد میں دیکھنے کی ہو سکتی ہیں۔ اگر پہلی شرط معیاری طور پر پوری ہو تو دوسری ساری ضروریات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ گذر بسر کے کم سے کم انتظامات اور عمر اور تعلیم کے توازن و تناسب کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔

حال یہ ہے کہ معاشرہ میں شادی مارکیٹ گویا دورِ قدیم کے نخاس بازار یا ترقیون کی منڈیاں ہے کہ لونڈیاں قطار در قطار کھڑی ہیں، دیکھیے، ٹٹولیے اور بھاؤ تاؤ کر کے مال سنبھالیے۔

تحریک اسلامی تو اس قسم کی منڈی سے نفرت کرتی ہے۔ اسلام اگر معیار ہو گا تو اس کی سوئی گھوم کر خود بتائے گی کہ امکانی صورتوں میں سے کدھر کا رُخ کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ان نئے جعلی معیاروں کے ساتھ ساتھ خاندانی اور نسلی حدبندیوں کی پرستش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ چاہے لڑکی ساری عمر جہنم میں رہے یا لڑکا گھر کی فضا کے درد کا درمان آوارہ گردی میں تلاش کرے، یا تعلیمی اور معاشی لحاظ سے آپس میں کبھی بات نہ بنے، ہر پھیر سے مقررہ کولہو میں دو افراد کو جوتنا ضروری ہے۔

پرانی جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت یہ کارفرما ہے کہ رشتے طے کرنے سے لے کر، جو پرانے حلقوں میں اب بھی بچپن سے طے ہو جاتے ہیں، شادی اور اس کے سارے مقتضیات تک کو اندھا دھند طے کرنا بڑوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، اور ان کے فیصلے گویا ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے سے ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے پر بچوں سے کچھ پوچھنا، مشورہ لینا یا کسی واسطے سے اُن کا عندیہ معلوم کرنا تو بالکل خارج از بحث ہوتا ہے۔ مائیں جو اولاد کے رجحانات نسبتہً

زیادہ جان لیتی ہیں۔ وہ اوّل تو بول نہیں سکتیں اور بول لیں تو لڑائی جھگڑے بلکہ مار دھاڑ کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو روایت کی کُند چھری سے ذبح ہوتے ہوئے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جاہلی رواج کا قصائی چھری پھیر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے اس طریقے کو شرعی سمجھ لیا گیا ہے کہ ماں باپ جو چاہیں کر دیں، حالانکہ شریعت نے لڑکے کا معاملہ تو الگ، لڑکی تک سے یہ پوچھنے کو لازم ٹھیرایا ہے کہ آیا وہ پیشِ نظر صورت میں راضی ہے۔ مگر اوّل تو کوئی لڑکی جس مروجہ جاہلیت کے قفس میں ہوتے ہوئے نفی میں جواب دینے کی جرأت نہیں کر سکتی، لیکن اگر کرے (جس کی شاذ عملی مثالیں میرے سامنے ہیں) تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاں کہہ دے۔ وہ ماں باپ کی عزت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ساری عمر کی بپتا سہیڑ لیتی ہے۔

اس جاہلی طرزِ عمل کا ردِّعمل نوجوانوں کی طرف سے کسی دوسری جاہلیت کی شکل میں رُونما ہوتا ہے۔ ایک تو پرانا طریقہ اغوا وغیرہ کا۔ اور دوسرے نیا طریقہ خاندانی روایات سے کلیتہً بغاوت کرنے کا۔ یہ دونوں خرابیاں دراصل نتیجہ ہیں پہلی بُرائی کا۔ میں کبھی کبھی یہاں تک سوچنے لگتا ہوں کہ کسی قسم کے جاہلی ردِّعمل میں پڑ کر غلط روش اختیار کرنے کے بجائے کوئی شعور رکھنے والی خود دار لڑکی سوال کرنے والے "وکیل" سے صاف صاف کہہ دے یا نکاح خوان کو پرچہ لکھ کر بھیج دے اور کہہ دے کہ یہ صورت مجھے منظور نہیں ہے اور میں شریعت کے دیے ہوئے حق کو استعمال کر رہی ہوں۔ مغربی طرز کی آزادیٔ نسواں کی تحریکیں چلانے والی بیگمات کے مشغلوں کی سطح دوسری ہے۔ اس عام سطح کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑکیوں کے اندر صحیح اسلامی حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلنی چاہیے۔

میں اپنی ان گذارشات کے لیے اپنی جگہ دلائل رکھتا ہوں، مگر ضروری نہیں کہ ہر بات کو دوسرے قبول ہی کریں۔ ہاں میں صرف ایک اصول کے متعلق اپنے ہم فکر دوستوں سے یہ ضرور اصرار کرتا ہوں کہ وہ ہونے والے زوجین کے صحیح اور حقیقی رجحانات کو مختلف طریقوں سے معلوم کریں۔ فیصلے کو التوا میں رکھ کر بار بار اس کے متعلق اندازہ کریں کہ یہ رضاکارانہ طور پر بلکہ دلی مسرت

سے قبول کیا جائے گا یا چار و ناچار۔

دراصل والدین اور اولیا کی اپنی بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں۔ کہیں بڑوں کے دیرینہ حسنِ تعلقات کا تقاضا سامنے ہوتا ہے، کہیں کسی زمین کا لین دین اٹکا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی بھاری قرض لیا ہوا ہوتا ہے یا لینا ہوتا ہے، کہیں کسی عزیز کو نوکری دلوانے کی راہ نکلوانی ہوتی ہے، کہیں کاروباری مفاد سامنے ہوتا ہے، کہیں سیاسی تقاضے دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر یہ سارے معاملات بڑوں کے اپنے معاملات ہیں، جن کی وجہ سے اولاد کی شادی کے معاملے میں نہ دلی میلان کی پروا کی جاتی ہے، نہ اُن میں تعلیمی ہم مرتبگی کو دیکھا جاتا ہے، نہ اُن کی عمروں کے تفاوت کا کوئی احساس ہوتا ہے، اور نہ اُن کی شکل وصورت اور عادات واطوار کے بیّن فرق پر نظر جاتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ بڑوں کے مصالح ومفاد اپنی جگہ، مگر وہ اولادوں کے ازدواجی مستقبل کو اُن کی قیمت میں دینے کا حق نہیں رکھتے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح وازدواج کو سادہ اور آسان بنانے کی سعی بھی کی، تعلیم بھی دی اور عملی نمونہ بھی نہ صرف خود اپنی طرف سے پیش فرمایا بلکہ اپنے صحابیوں کی زندگیوں میں اس کی جھلک پوری شان سے پیدا کی۔

بخلاف اس کے ہمارے یہاں نکاح اور شادی کو ایک بارگراں بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اجزا کو سنت کے تحت جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس مجموعی کارروائی کے لیے جو وسیع سنّت نہیں ملتی ہے، اُسے قبول نہیں کرتے اور قبول نہ کرنے والوں کے پاس ہزاروں دلائل ہیں۔ یہ بھی کہ وہ غربت کا دَور تھا۔ یہ بھی کہ آج کے ماحول کے کچھ نئے تقاضے ہیں، آج شادیوں کی تقریبیں سیاسی اور سماجی تعلقات بڑھانے اور معاشرتی مرتبہ بنانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شادی آج اس معنی میں بارگراں ہے کہ صرفِ دولت تو اسراف کی تمام حدوں کو توڑ ہی چکا ہے، اس کے ساتھ نمائش دولت اور مظاہرۂ دولت کی ایک اور بلا چمٹ گئی ہے۔ نمائش دولت کا یہ فتنہ شادی کارڈ سے لے کر بَری اور جہیز اور ولیمہ تک ہر جگہ رقص کرتا نظر آتا ہے۔

حالانکہ اصلاً شادی، نکاح یا ازدواج کا سارا کھیل اتنا ہی تھا کہ مجلس میں گواہوں کے سامنے

ایجاب قبول ہو، خطبۂ نکاح پڑھا جائے، دُعا مانگی جائے اور ان مراحل میں ضرورت کی حد تک اعلانِ نکاح ہو جائے اور بس۔

مگر آج جس طرح کا تماشا ہوتا ہے اس کے چند پہلو عرض کیے جا رہے ہیں۔

اس دور میں شادی کا پہلا شگوفہ دعوت نامہ یا شادی کارڈ کی شکل میں پھوٹتا ہے۔ آرٹ کے نادر سے نادر نمونے، کاغذ کی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام، کارڈوں اور لفافوں کی مختلف اشکال میں کٹنگ، رنگوں کی کرشمہ سازیاں، ہم جیسے درویش مزاج لوگوں کے دل تو کارڈ دیکھ کر ہی دہل جاتے ہیں، نہ معلوم ایسے کارڈوں سے جو کھیل کھیلا جائے گا وہ خود کیسا ہوش رُبا ہوگا۔

پھر اُستادِ فرنگستان کی پسند کے عین مطابق یہ کارڈ "بیگم و مسز فلاں" کی طرف سے جاری ہوگا یعنی گھر پر مہمانوں کو بُلانے کے لیے صاحبِ خانہ اور قائدِ خاندان کا فرلیندہ ہونا کافی نہیں۔

شریف و سنجیدہ لوگوں کو سیدھی طرح یہ طے کرنا چاہیے کہ ۵"×۳" (یا ۳×۵) سے بڑے سائز کا کارڈ کسی بھی صورت میں جاری نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی طرح صاحبِ خانہ کی طرف سے دعوت دی جائے گی۔ کارڈ سادہ قسم کے سفید کاغذ پر ہوگا اور بغیر کسی آرٹ ورک کے سیدھی سادی یک رنگی (سیاہ یا نیلی) تحریر میں چھپا ہوگا۔

یہ ہے تبدیلی کا نقطۂ آغاز!

شادی کی تقریب کو ایک بڑی کانفرنس یا سیمینار بنانے کے لیے ہزاروں دعوت نامے رشتہ داروں اور دوستوں، سرکاری افسروں، ادیبوں اور شاعروں، اخباری شخصیتوں کے نام نہ صرف شہر میں بلکہ ملک بھر کے مختلف گوشوں میں پہنچا دیئے جائیں گے۔ حالانکہ لڑکے والے ہوں یا لڑکی والے، اتنا کافی ہے کہ چند قریبی رشتہ داروں کو بلایا جائے۔ چند اہم ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں کو مدعو کر لیا جائے۔ اور بقیہ حلقۂ تعارف کو اگر خطوط جائیں تو اس مضمون کے ہوں کہ آپ اس تقریب کے لیے وقت، پیسے، جسمانی تکلیف اور کام کے ہرج میں نہ پڑیں، صرف تقریب کی کامیابی اور زوجین کے حسنِ تعلق کے لیے دُعا فرمائیں۔

اب اگر ہر صحافی، ہر عالم، ہر ادیب، ہر سیاسی لیڈر، ہر سرکاری افسر اور تحریک اسلامی کا ہر نمایاں فرد یہ چاہے کہ وہ بیٹے یا بیٹی کی شادی کی تقریب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم رنگ لوگوں کو جمع کر کے خاص طرح کے اثرات پیدا کرے گا تو اس طرح تو اصلاحِ احوال ممکن نہیں۔ قصبوں اور بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ ہزاروں کا مجمع جمع کر لیتے ہیں۔ اور ان کی تقلید میں شہر کے متوسط الحال اور محنت کش بھی امکانی حد تک ایک ہجوم کا انتظام کرتے ہیں، پھر اس سے آگے دیہات کے جاگیردار اور وڈیرے تو الگ رہے، معمولی حالات کے لوگ بھی ایک انبوہ بہم کر لیتے ہیں۔

حالانکہ ایسی تقاریب بسا اوقات تو بارگراں بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے دو ماہ میں صرف اپنے شہر سے ہی مجھے ہر ہفتے کبھی ایک اور کبھی دو دعوت نامے موصول ہوئے۔ اب ان میں جا کر کون کس سے کیا سیاسی یا ادبی یا صحافی اثر لیتا ہے۔ ہر کسی کو جلدی پڑی ہوتی ہے، نکاح میں شمولیت کی یا ولیمہ کھایا اور رخصت۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

مجھے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر ان تقریبوں کو گھریلو اور خاندانی حد تک محدود رہنا چاہیے! دوچار افراد کو ہم مقصدی یا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر بلایا جا سکتا ہے۔ مگر کوشش یہ کرنی چاہیے کہ لڑکی اور لڑکے والے دونوں گھروں میں ۵۰،۵۰ سے زیادہ مہمان (مع خواتین) نہ ہوں۔ زیادہ بڑی قریبی برادری والوں کو کسی قدر ڈھیل مل سکتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ وہ میلہ ہی لگا دیں۔

شادیوں کا ایک بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سسرال والے کیا دیں گے یا لڑکوں کی طرف سے بری کیسی آئے گی۔ اور مہر کتنا ہو گا۔ اور لڑکی والے جہیز میں کیا کچھ دیں گے۔ بلکہ شادیاں طے ہونے میں یہ سوال بہت دخل رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سچے مسلمانوں کے سوچنے کا یہ انداز ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کجا یہ حال کہ آج کل ایک دوسرے سے مطالبے کیے جاتے ہیں، خصوصاً لڑکی والوں کو تو مجبور کیا جاتا ہے کہ اتنے تولے سونا اور فرج اور ٹیلی وژن ضرور دینا ہو گا۔

اس ذہنیت کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں طرف سرمایہ، اسلامیت ہے اور دولتِ شرافت

ہے تو پھر کسی فریق کو دوسرے کے متعلق نہ خاص اُمیدیں لگانی چاہئیں، نہ مطالبے کرنے چاہئیں، اور نہ ساری عمر لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو، اور نہ لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی اور اس کے والدین کو یہ طعنے ملنے چاہئیں کہ تم لوگوں نے تو حق ادا کیا ہی نہیں، وغیرہ۔

اس معاملے میں دونوں طرف غیرت و حمیت اور بے نیازی و خودداری ہونی چاہیے۔ جو کچھ لڑکے والوں کی طرف سے از خود ہو سکے وہ قبول، اور اسی طرح لڑکی والوں طرف سے رضاکارانہ اور مخلصانہ جذبے سے جو کچھ ہو سکے وہ منظور۔

بلکہ دونوں فریق ابتدا ہی میں مل کر یہ بات ہمدردانہ جذبات سے طے کرلیں کہ بھائی نہ اپنے اوپر بے جا بوجھ ڈالنا اور نہ قرض لینا اور نہ برائے نمائش کوئی کام کرنا۔ اور یہی مشورہ دوسری طرف سے ہو۔ جو کچھ جس کے بس میں ہو وہ وہی کچھ کرے۔ جیسا کھانا دے سکتا ہے، دے — اور جیسا سامان وہ فراہم کرسکتا ہے، کرے۔ دونوں طرف صاف دلی سے اپنے اپنے گھروں کے تمام لوگوں کو اس پر پہلے سے مطمئن کرلیں کہ ہمارا اصل مقصد رشتہ و ربط ہے، کسی دُنیوی مفاد کو کمانا مطلوب نہیں ہے۔

کتنی ہی ہماری بہنیں اور بیٹیاں شریف دینی گھرانوں میں باوجود تعلیم اور شکل و صورت اور خانہ داری کی مہارت کے کنواری بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں، مگر ان کو معاشرہ اس امر کی سزا دیتا ہے کہ تمہارے والدین اور تم اتنی مقدار میں جہیز فراہم نہیں کرسکتے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ہم میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ اس طرح کی دردناک صورتوں میں کسی مظلوم بچی یا خاتون کی دستگیری باوجود خوش حالی کے، اور باوجود دولت مند گھرانوں سے رشتے ملنے کے، کی گئی ہو۔

اُسی طرح دوسری جانب یہ عبرت انگیز نقشہ بھی موجود ہے کہ کسی غریب مگر نیک نہاد اور قابل نوجوان کو کوئی گھر اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ کوئی بڑا مہر نہیں دے سکتا یا شاندار بری نہیں دے سکتا۔ یا الگ رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں بنوا سکتا۔

نتیجہ یہ کہ لوگ اسلامیت اور شرافت اور پردہ داری کے بالمقابل بالکل تارکِ دین اور غلامانِ مغربیت و اشتراکیت تک سے قارورہ جا ملاتے ہیں۔

کوئی اپنے بلند معیارات سے نیچے اُترنے پر تیار نہیں ہے، کوئی اپنی مالی سطح سے نیچے نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ اور کوئی اپنے گھرانے سے باہر جھانکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اور اسلام دُور کھڑا یہ سارا تماشا دیکھتا رہتا ہے۔ قیمتی ہیں وہ چند افراد جنہوں نے ان سلاسل و اغلال کو توڑ کر اسلامیت کے علم کو بلند کیا ہے! فکثّر اللہ امثالھم۔

میری نگاہ سے کفو کا مسئلہ اوجھل نہیں ہے۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ مگر کفو کے مفہوم کو متعین کرنے میں فرق ہو سکتا ہے۔

کفو کے مسئلے کا صحیح مفہوم ان مناکحتوں کے تفصیلی مطالعہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیں، اور پھر جن کا انعقاد صحابہ کرام کے مختلف قبیلوں کے درمیان کرایا۔ ایک کلمہ و مقصد کے مہاجرین و انصار کے درمیان کفو کا وہ تصور وسیع ہو گیا جو دورِ جاہلیت میں انتہائی محدود تھا۔

بعد کے احوال و واقعات نے تبدیلیاں پیدا کیں۔ جب پیشے نسلاً درنسل چلنے لگے تو آسانی اسی میں سمجھی گئی کہ کاشتکاروں کی اولاد، نوربافوں کی اولاد، کفش دوزوں یا گل گروں کی اولاد اور اسی طرح عالموں یا مولویوں کی اولاد اگر اپنے ہی جیسے گھروں سے مربوط ہو تو ذوق و عادات کی ہم آہنگی اور گھروں میں بولی جانے والی اصطلاحات اور مخصوص قسم کے رواجوں اور روایات کا فہم سہل تر ہو گا۔

اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ہمارا پالا ہندو سوسائٹی سے پڑا جو چار حصوں میں تقسیم تھی اور ہر حصے کے فرائض جُدا جُدا تھے۔ لہٰذا ہر حصے کے لوگ اپنے ہی سلسلے کی برادریوں میں جگہ پا سکتے تھے۔ اس حالت کو پہنچ کر ہمارے ہاں کفو کا تصور اور بھی بوجھل پتھر بن گیا۔

لیکن آج جب کہ مختلف پیشوں اور مشاغل کا تسلسل درہم برہم ہو چکا ہے، تعلیم اور عہدوں نے پرانے خاندانوں سے اُٹھنے والی اولادوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کفو کے مسئلے پر نظرِ ثانی کی جائے۔ کفو کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دو گھروں کے زوجین جب ہم ہوں گے تو ان کی تعلیم، ان کا ذوق، ان کا مقصد، ان کی عادات اور ان کے طور طریقے یگانگت پیدا کرتے

میں نمد ہونے چاہئیں۔ نیز دونوں طرف کے خاندانوں میں بھی معاشرت کی کوئی خلیج حائل نہیں رہنی چاہیے۔
میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والے تعلیم یافتہ، شریف اور باعصمت زوجین دوسری کسی صورت کے مقابلے میں ہزار گونہ زیادہ اسباب ایسے رکھتے ہیں جن پر کفو کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

ایسے ہم عقیدہ و ہم مسلک لوگوں کو تو آغاز کار اس اور اک حقیقت سے کرنا چاہیے کہ کلکم من آدم و آدم من تراب۔

اب میں بارات کی تیاری کے مسئلے کو لیتا ہوں۔

رواج ہو گیا ہے کہ بڑی بارات لے کے جایا جائے اور رعب بٹھایا جائے کہ ہمارا دائرۂ اثر بڑا وسیع ہے۔ دائرہ اثر ہر ایک کا اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ سو ڈیڑھ سو یا دو سو آدمی اکٹھے کر لے جائے، اور باراتوں میں بہت سے آدمی اکٹھے کر لینے کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کہ کسی طرف حقیقی رتبۂ بلند یا سماجی مرکزیت موجود ہے۔ ہو بھی تو اس کی نمائش کی کیا ضرورت۔ آپ دوسروں (جو در حقیقت اپنے ہی ہیں) کے سر زیادہ بوجھ ڈال کر فخر کیوں محسوس کریں۔

پھر ایک تماشا دولہا کے ہار سنگھار کا ہوتا ہے۔ پہلے طلے والے کئی ہار پھر اوپر نوٹوں کے ہار کہیں ایک ایک روپئے والے نوٹوں کے ہار بنے بنائے خریدے جاتے ہیں، کہیں دس دس روپے والے اور کہیں سو سو روپے کے نوٹوں کے۔

یہ تو گویا صریح طور پر اظہار ہے وافر دولت کا، یعنی دولت اچھل رہی ہے، ابلی پڑتی ہے۔ بالعموم اس قسم کے ہار کم پڑھے لکھے، کاروباری لوگوں میں رائج ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی کلرک اور جمعدار تک یہ ڈراما کرتے ہیں اور یا پھر مشرقِ وسطیٰ سے کمائی کر کے لانے والے محنت کشوں کے گلے میں دولت کے یہ بندھن زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

بھئی اگر دولہا کو عام بارات سے ذرا سا نمایاں ہی رکھنا ہے تو گلاب کے پھولوں کا ایک ہار

ؔ اس مقصد کے لیے بڑی مقدار میں یہ نوٹ کھلی بلیک مارکیٹ میں بکتے ہیں۔

اس کے گلے میں ڈال دو، اور بقیہ باراتیوں کو موتیے کا ایک ایک ہار دے دو۔ ضرورت کے لیے تو اتنا کافی ہے۔ اگرچہ میں نے حال ہی میں ایک ایسی مثالی شادی کی مثال اور مختصر بارات بھی دیکھی ہے کہ دولہا تک ہر قسم کی خصوصی آرائش سے بے نیاز تھا۔ واہ وا!

پھر دولہا کی کار سجتی ہے۔ اس کے لیے ملنے کی بھی اور پھولوں کی بھی ایسی جالیاں بکتی ہیں جو کاروں کو "پہنا" دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر کار کو ضرور نمایاں ہی کرنا ہو تو اس کے سامنے کے شیشے کے اُوپر کی جانب پھولوں کا ایک ہار، یا گوٹے یا طلے کی ایک سادہ سی لڑی کافی ہے۔ اسے محض ایک علامت کی حد تک رہنا چاہیئے۔

مجلس نکاح کا انعقاد بالعموم محلے کی قریبی مسجد میں ہو تو افضل ہے، ورنہ کسی اور قریبی کشادہ جگہ پر نشست کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ مجلس نکاح کے عام شرکاء کی تواضع زیادہ سے زیادہ کسی ٹھنڈے مشروب یا چائے کی پیالی سے کر دینا کافی ہے۔ کھانے کا انتظام صرف بارات کے لیے ہو اور بالکل حدِ استطاعت میں۔ لیکن کھانے پینے کے تمام انتظامات خواہ لڑکی والوں کے ہاں ہوں یا لڑکے والوں کے ہاں (خاص طور پر ولیمہ)، ہرگز "بوفے" سسٹم پر نہ کیے جائیں۔ یہ اسی تہذیبِ اغیار کی ایجاد ہے جس کے خلاف ہماری اُصولی لڑائی ہے۔ اس کے طور طریقوں کی تقلید سے انتہائی طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرسیوں کا انتظام نہ کر سکیں وہ دریاں بچھا لیں، جہاں ایک ہی مرتبہ سارے حاضرین کی تواضع ممکن نہ ہو (حالانکہ ۵۰ کی تعداد ایسی نہیں) تو دو نشستیں کر لی جائیں جیسے کہ ہمارے ہاں قدیم دستور رہا ہے۔ ان لوگوں کے تو ذہن ناقابلِ فہم ہیں جو ہزاروں روپے دوسرے اُمور پر خرچ کرنے کے بعد صرف کرسیوں یا دریوں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے (ہائے بیچارے مفلسینِ قوم!)

لڑکے والے گھر میں زور شور سے اور لڑکی والے گھر میں کسی قدر کم پیمانے پر روشنیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ حد کر دیتے ہیں۔ ۵۰، ۵۰ ٹیوب لائٹیں لگی ہیں۔ عمارت کی دیواروں اور درختوں اور جھاڑیوں کو چھوٹے چھوٹے رنگدار بلبوں کی کثیر تعداد سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات روشنیوں کی لمبی قطار دُور سڑک تک جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔

میں نے خود دیکھا کہ ایک کوٹھی پر تین چار دن تک رنگ برنگی روشنیوں کو اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ شاید ہی کوئی انچ جگہ خالی ہو۔ ایسے مناظر کیا روٹی اور دوا سے محروم غریبوں کا خون نہ کھولا دیتے ہوں گے۔ بجلی کی کمی کا ماتم تو الگ رہا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کام کرنے یا مہمانوں کو بٹھانے یا کھانا کھلانے کی جگہ اعتدال سے روشنی کا انتظام کیا جائے۔

ہم لوگ جس دولت کو اس طرح اڑا دیتے ہیں کیا یہ دوسروں کی حق مارنا نہیں ہے اور کیا ہمیں پیسے پیسے کا حساب آخرت میں نہیں دینا ہوگا۔ کیا دُنیا اندھیر نگری اور دولت ایک خوانِ یغما ہے کہ جس کا جتنا جی چاہے لوٹ لے اور پھر اس کو چاہے تو دریا برد کر دے، چاہے تو آگ لگا دے۔ جی نہیں! یہ خدا کے خزانے کا مال ہے اور اس کے ہر ذرّے کا حساب دینا ہوگا۔

پھر کہیں باراتوں کے سامنے بینڈ باجے اور گولے پٹاخے ہیں اور کہیں لڑکے والوں کی طرف سماعت شکن واہیات ریکارڈنگ کا طوفانی شور ہے اور لڑکی والوں کی طرف "گھڑے مٹکالی" اور ڈھولک کے پاکیزہ گھریلو گیتوں سے معاملہ آگے بڑھ کر "اپدا" والی ثقافت تک جا پہنچا ہے۔ کچھ فلمی بول بھی ہیں، کچھ دھمال لڈی بھی ہے، فن کی ماہرات بھی جا شامل ہوتی ہیں بلکہ بلوائی جاتی ہیں۔

گویا شادی نہ ہوئی کوئی سلطنت فتح ہو رہی ہے اور اس کا جشن منایا جا رہا ہے۔ اسلام میں تو ایسا جشن بھی سجدۂ عبودیت سے منایا جاتا ہے۔

یہ مسلمان جن کے آدھے بھائی افغانستان اور فلسطین، لبنان اور شام، بھارت اور حبشہ، فلپائن اور افریقی ریاستوں میں ہزار در ہزار ذبح ہو رہے ہیں اور آدھے بھائی مہاجر بن کر دُنیا کے متعدد کیمپوں میں پڑے ہیں، اور جن کے ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت جدید اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کا یہ حال ہے۔

ان ساری لغویات کو چھوڑ کے بغیر الٰہِ واحد کی عبادت اور اس کے دین کی سربلندی کا کام

نہیں کیا جاسکتا ۔

شادیوں میں لڑکے اور لڑکی والوں کے گھروں میں چاہے کچھ پردہ بھی ہو، مہمان خواتین کی وجہ سے بے پردگی کی بہار آتی ہے کہ لباسوں کی رنگینی اور زیورات کی چمک دمک اور میک اَپ کی قہرمانی کا طوفان دین و اخلاق کی ساری قدروں کو بہالے جاتا ہے۔ میں نے ایسے جو منظر دیکھے ہیں ان کی وجہ سے تقاریب نکاح کی کراہت دل میں بیٹھ گئی ہے۔

شریف دیندار لوگوں کو نہایت جرأت کے ساتھ دعوتی کارڈ کی پشت پر ضروری گذارشات میں یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ جو خواتین شریک ہوں، براہ کرم لباس اور زینتوں اور میک اَپ کو چھپاتے والے مکمل پردے کے ساتھ شریک ہوں اور مردوں میں گھسنے اور دروازے سے بار بار جھانکنے سے پرہیز کریں۔ یہ بات محذوف ہی رہنے دی جائے کہ جن سے یہ پابندیاں نہ اُٹھائی جاسکتی ہوں وہ معاف ہی رکھیں۔ اور اپنے تعلقات کے تقاضے کسی دوسرے وقت پورے کرلیں۔ کیونکہ کسی گھر میں ایسی خواتین کی جبلت بھرت مہمانوں اور محلے داروں پر بھی یہی اثر چھوڑے گی کہ یہ تارکین پردہ کا گھر ہے۔

جس ملک میں پردے کے خلاف امریکہ اور اسرائیل اور روس کی تہذیب نے یہ جنگ چھیڑ رکھی ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین کردہ نظام پردہ کو ختم کرنا ہے، وہاں دوسروں کے لیے اس طرح کی غلط فہمی کا راستہ کھولنا بھی خطرناک ہے۔

یہاں ایک افسوس ناک حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ بہت سی صورتوں میں دولہا کی جانب سے شادی کے وقت یا کچھ دیر بعد لڑکیوں سے پردہ ترک کرنے کی شرط منوائی جاتی ہے اور اس شرط کے سامنے ایسے ایسے والدین اور ان کی بیٹیاں تک سر جھکا دیتی ہیں جنھیں اسلامیت اور پردہ داری کے لحاظ سے معروف مقام حاصل ہوتا ہے۔ پردہ کے خلاف ابلیسی جنگ کے ایسے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔

نیز بیچ میں مہندی اور تیل وغیرہ کی رسموں اور ان کی مقررہ شریعت کا معاملہ رہا جاتا ہے۔ یہ سب

فضول باتیں ہیں، ہندو تہذیب کے اثرات ہیں، ان کو چھوڑ کر بغیر کسی تقریب کے مہندی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ خود لڑکی والے اپنی طرف سے بھی کر سکتے ہیں اور لڑکے والوں کو بھیجنی ہے تو وہ بھی لمبے چوڑے چکروں کے بغیر بھیج سکتے ہیں۔ تیل وغیرہ کو چھوڑ دیجئے، لایعنیات کا سلسلہ لمبا نہ کیا جائے۔

اب لیجیے، مہر کی بات!

لڑکی والوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی رقم کا مہر باندھیں اور وہ لڑکے کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ، غرض کہ جس معاشی مرتبے کا لڑکا ہو اُس کے مطابق مقدار مقرر کی جاتی ہے، بلکہ ضد کی جاتی ہے، جھگڑے کیے جاتے ہیں، کبھی تو اس پر رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دراصل لڑکی والے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رسّہ ہے جو وہ ہونے والے داماد کے گلے میں ڈال کر اُسے اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں اور اس رسّی کا سرا لڑکی کو بھی تھما سکتے ہیں۔ حالانکہ بھاری مہروں نے نہ کبھی ٹوٹتے نکاحوں کو بچایا ہے اور نہ پھلنے پھولنے والے نکاحوں کو کم مہروں نے ناکام کیا ہے۔ مہر ہی نہیں، خرچے لکھوانے اور بعض شرائط منوانے تک بات جاتی ہے۔

دوسری طرف لڑکے والے ہیں جو اس "سودا بازی" میں کم سے کم قیمت پہ تو بات کو لانے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اکثر اوقات ایک آواز شرعی مہر کی بھی سننے میں آتی ہے اور اس کی مختلف مقداریں اہل تاویل نے متعین کی ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جہاں کھلے دل سے اپنا اعزاز سمجھ کر لڑکے والے اغنیاء نے بڑے بڑے مہر خوشی خوشی مقرر کیے ہیں، وہاں ایک طرف خود حضورؐ کی طرف سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا ہوا سادہ سا جہیز ایک دلکش نمونہ ہے۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی شادیوں کے مہر ایسے بھی مقرر ہوئے کہ شوہر اپنی بیوی کو علم سکھا دے گا، یا پیغام دینے والا اُمیدوار اسلام لے آئے گا اور اسلام لانا ہی اس کا مہر ہوگا۔

بدیں وجہ مہر کے متعلق کوئی ایسا قطعی منصوص اور صحابہ میں معمول بہ مہر نہ تھا جسے اب صدر صاحب کی طرح "شرعی جمہوریت" کی مانند شرعی مہر قرار دیا جا سکے۔

مہر ایک تو رشتہ کشی سے مقرر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ شخص متعلق کی حیثیت کے مطابق اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اگر زیادہ مہر مقرر کرے تو اسے اپنا اعزاز سمجھ کر مقرر کرے عورتوں سے حسن سلوک کا بہترین معیار قائم کرنے والے مرد بھی بہترین کردار کے ہوتے ہیں۔

دوسرے مہر صرف شادی کے وقت کی مالی حالت کی بنیاد پر ہی مقرر نہیں کیا جانا، بلکہ مستقبل قریب کے معاشی امکانات کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور ایک مرد کی نگاہ کو دور تک جانا چاہیے۔ آخر اور کاموں کے لیے وہ مستقبل کی امید پر قرض لیتا ہے تو نکاح ہی کے لیے مستقبل کی امید پر مہر غیر معجّل کی مقدار کیوں زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ مکان بنانے اور گاڑی خریدنے کے لیے تو سود پر بھی قسطوں والے نظام فروخت میں ذمہ داری اٹھالی جاتی ہے، آخر بیوی ہی کو اقساط میں کیوں ادائیگی نہیں کی جاسکتی۔

لڑکی والوں کی بھی اسلامیت اور شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ مہر کو مرد کے لیے ایک لگام اور رشتے کی نیت سے استعمال کرنے کا ذہن ہرگز بیچ میں نہ آنے دیں۔

کسی مرد کا دیندار، شریف اور شائستہ اطوار ہونا ہی اس کا سب سے بڑا مہر ہے۔

اسی طرح بری کے معاملے میں بھی سارا معاملہ مرد یا اس کے خاندان پر چھوڑ دینا چاہیے۔

مہر کی بات آئی تو یہی معاملہ جہیز کا بھی ہے۔ کسی شخص یا خاندان کا یہ سوچنا کہ ایک لڑکی (یا اس کے والدین) اس کا گھر بھرے اور شادی ایک معاشی مسئلہ اور کمائی کا ذریعہ بنے، مرد کے لیے تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اگرچہ اخلاقی انحطاط کے موجودہ دور میں چلو بھر پانی میں ڈوبنے والے نہیں رہے۔ بلکہ تالابوں اور سمندروں کے پانی میں تیراکی کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، مگر پھر بھی مردانگی کا ایک عزّ و وقار ہے۔ اس کا مقام غیرت و خودداری ہے۔ وہ (یا اس کے گھر والے) اتنی گری ہوئی بات کہنے پر آمادہ ہی کیوں ہوں کہ آنے والی لڑکی کے لیے لازم ہے کہ وہ دولت کا ایک طوفان اور سامانوں کا ایک انبار لے کے آئے۔ مردوں میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم کپڑے اور زیور سے لے کر فرنیچر اور برتنوں تک اور سامانِ آسائش سے لے کر سامانِ آرائش تک سب کچھ حسبِ منشا خود فراہم کریں گے، مگر فریقِ ثانی کے سامنے یہ سوال یا مطالبہ رکھنا کہ

ہمیں یہ یہ کچھ اور اتنا اتنا دیا جائے۔ ایک طرح کی گداگری ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ تمام والدین اپنی لاڈلی بچیوں کے لیے کچھ نہ کچھ سروسامان کرتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ لیکن حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر اتنا خرچ کرتے ہیں کہ بسا اوقات قرض اُٹھا کر بعد میں بڑھاپے کی زندگی نہایت مشکلوں سے گذارتے ہیں۔

لڑکے والوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اپنا ہی ایک دوسرا گھر مصائب سے دوچار ہو، یا قرض کی وجہ سے ذلیل وخوار ہو۔ یہ حالت تو رحم کھانے کی ہے۔

جہیز کے معاملے میں (بَری کی طرح) ایک مصیبت یہ ہے کہ اس کی نمائش بے حد ضروری ہے۔ ماں بڑے فخر و ناز سے دکھاتی ہے کہ اس نے کیا کیا زیور بنوائے ہیں، کتنا سونا خریدا ہے، کپڑوں کو پھیلا کر دکھاتی ہے کہ ان میں بیشتر جوڑے "باہر کے" ہیں، ورنہ اگر پاکستانی کپڑے کے ہوں تو ناک نہ کٹ جائے اور سسرال والے بگڑ نہ جائیں۔ پھر برتن، صوفہ سیٹ، دو دو پلنگ، چار چار بستر، اس سے آگے بڑھ کر فرج اور ٹیلی وژن، ورنہ کم سے کم ریڈیو سیٹ، پریشر کُکر، برقی استری، واٹر کولر، ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، چائے کے سیٹ کافی کے سیٹ، فروٹ پیش کرنے کے سیٹ، ڈرائی فروٹ رکھنے کا سامان، دولہا دلہن کے لیے گھڑیاں، پھر سنہری کام کے جوڑے، کشیدہ کاریاں، سردی کے خاص لباس ——— غرضیکہ ایک صحن میں پورا انارکلی سما جاتا ہے۔

اُونچے گھرانے کی ریس کرنے والی یہ مائیں پچھلے کئی کئی سال اپنی اور بچوں کی غذائی اور دوائی ضروریات میں کمی کرتی ہیں، پھر قرض چڑھا کر اُسے اُتارنے کے لیے طرح طرح کی مشقتیں کرتی ہیں حتیٰ کہ اُن کی پوری زندگیوں کا چَین دو ایک لڑکیوں کے جہیز کی چکی میں پس جاتا ہے۔ مگر خود پرست انسانوں کو اُن پر رحم نہیں آتا۔ کیونکہ اُن کے مقابلے پر کوئی دوسری مائیں زیادہ مال ومتاع لیے موجود ہوتی ہیں۔ یہ فری کمپیٹیشن کی مارکیٹ ہے۔ اس میں اخلاق کا سکہ نہیں چلتا بلکہ مال کی قدر مانی جاتی ہے۔

جہیز کے متعلق کسی حالت میں دوسرے فریق کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ قرض یا معاشی مصیبت جھگتنے سے روکنا چاہیے۔ جہیز جو کچھ بھی بنے، حالات کے مطابق سہولت سے بنے۔ خوشی سے لیا

جائے، دکھاوا نہ کیا جائے (نہ اُس گھر میں نہ اِس گھر میں)، اور کبھی ساری عمر جہیز کی کمی کا ماتم نہ کیا جائے۔ اور لڑکی یا اُس کے والدین کو طعنے نہ دیے جائیں۔

یاد رکھیے کہ کسی معمولی بھالی پردہ پسند دیندار لڑکی کی عصمت و عفت اور اُس کی نگاہوں کی پاکیزگی اور دُنیا کی لذتوں اور کھیل تماشوں سے بے نیازی ایک ایسی گراں بہا متاع ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جہیز ان چیزوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔

پاک دامن لڑکیوں کا مرتبہ اتنا بلند ہے جو لوگ شوخ و شنگ محفل گرد حسیناؤں کے ڈسے ہوتے ہیں وہ ساری عمر نسوانی پاکیزگی کو ترستے رہتے ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں ولیمہ بھی ایک بڑا غور طلب اور اصلاح طلب موضوع ہے۔ ولیمہ کا کارڈ بھی اگر الگ سے جاری ہو تو وہ بھی (پہلے ذکر کردہ دعوت نامے کی طرح) سادہ ہونا چاہیے۔ ولیمہ میں کئی کئی کھانوں اور پھلوں کا انتظام کر کے شانِ امارت دکھانے کی ضرورت نہیں۔ متوسط طریقے سے سیدھے سادے دو ایک کھانے ہونے چاہئیں۔ ولیموں میں زیادہ تعداد دونوں طرف کے رشتہ داروں کی ہو، تھوڑے بہت احباب بھی شامل ہوں، مگر ہدایتِ نبویؐ کے مطابق ایک تعداد غریب طبقے کے پڑوسیوں کی بھی ہو۔ انہیں بھی عزت و آبرو سے بٹھا کر مناسب انداز سے کھانا کھلایا جائے بلکہ اگر خوش حال لوگوں کے ساتھ ہی انتظام ہو تو ان میں طبقاتی تفاوت کے احساسات کو نشوونما نہیں ملے گی۔

آج کل تو ایسے ایسے ولیموں کا انتظام ہوتا ہے جیسے دورِ عباسی میں ملکۂ خیزران کی شادی کا اہتمام ہو رہا ہو۔

خدا کے بندو! بندگی و مسکینی کی سطح پر اپنے آپ کو لاؤ۔ اور شادی کے ہر مرحلے کو نمائشِ دولت کا ذریعہ نہ بناؤ۔

جسے خدا نے ضروریات سے زائد دولت دی ہے وہ اس میں شادی بیاہ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ حصہ غلبۂ اسلام، تبلیغ دین، تعلیمِ قرآن، یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی بہبود اور مریضانِ دق و جذام کے علاج کے لیے صرف کر کے ایک مثال قائم کرے۔ اور نہیں تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ شادی

کہ فریقین اپنے اپنے خرچ کا پانچواں یا دسواں حصہ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے متعین کر دیں۔

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ تحائف اور سلامیوں کا سلسلہ بھی اب جملہ حدود کو پھلانگتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اندرونِ خانہ کے محدود حلقۂ اعزہ کے سوا سب کو اس طرح کی تکلیف سے روک دیا جائے۔ ایک تو لوگ شرکت کے لیے وقت اور مصروفیات کی قربانی دیں، اوپر سے تحائف کا انتظام بھی کریں اور اس میں بھی اظہارِ قرابت و خلوص کا مقابلہ کہ کیا چیز دوسروں سے بڑھ کے نادر محسوس ہو۔

اس طرح سلامیوں کا سلسلہ اب پچاس اور سو روپے کی حدوں سے بھی تجاوز کر کے پانچ پانچ سو روپے تک پہنچ گیا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی میرے علم میں آئیں کہ لاکھ روپیہ تک سلامی میں ایک پارٹی رکھتی ہے۔

سلامیاں وغیرہ بھی قریبی گھریلو رشتہ داروں میں اعتدال سے چلیں اور اگر کسی کو دس یا پانچ روپے کی توفیق ہو تو اس کی طرف سے اسی کو علامتِ خلوص سمجھا جائے۔

شادی ہو چکنے کے بعد ازدواجی زندگی کی خوبصورت اٹھان ہی وہ اصل چیز ہے جس پر توجہ دی جانی چاہیے۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو جادۂ حیات کی ہم سفر اور رفیقِ منزل سمجھے، نہ یہ کہ ایک خادمہ یا لونڈی حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی نسائی فطرت کی وجہ سے اسے ہر وقت غیظ و غضب، طعن و طنز اور بداعتمادی اور سوئے ظن کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتیں مردوں کے پاس خدا کی طرف سے ایک امانت ہیں۔ ان کے ساتھ بلاوجہ بدسلوکی اور بدگوئی کا رویہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ ذمہ داری بھی مرد ہی کی ہے کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے احترام اور بیوی کی محبت کے حدود قائم رکھے اور کسی ایک طرف جھک کر انتہا پسندی اختیار نہ کرے۔ جو بیوی کے حقوق و معاملات ہیں ان میں دوسرے لوگوں کا کوئی دخل نہیں، جو ماں بہنوں کے حقوق ہیں ان میں بیوی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اب یہ مرد کا اپنا کام ہے کہ الگ رہن سہن اگر میسر نہ ہو تو عدل کی تلوار کی دھار پہ اس توازن سے چلے کہ معاملے کو کسی طرف سے بگڑنے نہ دے۔ جہاں کہیں بیوی و شوہر دونوں کی طرف سے محبت اور

اعتماد اور تحفظ حاصل رہتا ہے۔ وہاں ملے جلے گھروں میں کچھ زیادہ خرابی نہیں ہوتی۔ بصورتِ دیگر گھر پہ سالوں سے چھائی ہوئی دو تین عورتیں جب ایک نئی عورت کو اس دائرے میں داخل ہوتا دیکھتی ہیں تو بالعموم اس کا جینا دوبھر کر دیتی ہیں، جب کہ شوہر صاحب یک طرفہ سماعت رکھتے ہوں۔ ایسے گھوگھو ٹائپ شوہر ساری ساری زندگیاں اپنے گھر کو امن و سکون سے محروم کر کے گذار دیتے ہیں۔ نہ خود آرام سے رہتے ہیں، نہ بیوی کے لیے چین اور نہ بچوں کے لیے سکون۔ محض دل کے یک کیے خوف سے پیدا شدہ ایک مبہم احساس کے مہیب سایوں کو اپنے اُوپر اور گھر کے اُوپر مسلط رکھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو یہ حکمت معلوم نہیں کہ شوہر ایک مدت میں بیوی کو گھڑ کر تیار کرتا ہے اور بیوی کچھ عرصے میں اپنا شوہر تراشتی ہے۔ بعض رویّے دوسرے فریق کے لیے چھوڑنے پڑتے ہیں اور بعض انداز اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام گھر بلو مارشل لا سے نہیں محبت و اعتماد سے انجام پاتا ہے۔

یوں تو اب مشترک خاندانی نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے، مگر جہاں باقی ہے وہاں لوگوں کو چاہیے کہ اپنی پرانی روش کو بدلیں اور نئی آنے والی خاتون کو کھلے دل سے خوش آمدید کہیں اور اُسے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون دیں اور اس میں اعتماد پیدا کریں۔ ورنہ اگر ہر وقت ٹیڑھی باتیں کی جانے لگیں تو اس دَور کی حساس لڑکیوں کو اُس طرح اندھے صبر کے کولھو میں نہیں پیلا جا سکتا۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ نہ اب زمانہ وہ رہا ہے کہ شادی سے پہلے جن دو گھروں میں محبت تھی، شادی کے فوراً بعد ان دونوں میں محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

شادی کی تجویز کرنے سے پہلے گھر کے نئے نقشے کے متعلق ہونے والے شوہر صاحب بھی اور ان کے والدین اور بھائی بہنیں بھی اچھی طرح سوچ لیں۔

یہ ہے اصلاحات کا خاکہ جو میرے ذہن میں ہے۔

جیسا کہ اُوپر میں نے کہیں لکھا ہے کہ بعض خدا پرست اور تحریک اسلامی کے فدائی اور کارکن زندگی کے معاملات میں غلط طریقے اختیار کرتے ہوئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ بیوی نہیں مانتی، بچے ساتھ نہیں دیتے، برادری اتفاق نہیں کرتی۔

اس بارے میں میں اپنے خیالات کا اظہار آئندہ کسی موقع پر کروں گا۔

تحریکِ اسلامی اور موجودہ صورتِ احوال[۱]

میاں طفیل محمد قائد تحریکِ اسلامی، سابق امیر جماعت اسلامی (کالعدم)

تحریکِ اسلامی موجودہ صورتِ حال پر شدید تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ موجودہ بحران کی پُر پیچ اُلجھنوں نے ایوب خانی آمریت اور بھٹو کی فسطائیت کی تلخیوں کو تازہ کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسا ہمہ جہتی بحران ہے کہ ایک طرف حکومت قانون ہی نہیں، دستور کے تقاضوں کو پامال کرنے پر اُتر آئی ہے، انتخاب عام کے سلسلے میں ایسے عجیب و غریب غیر جمہوری تصورات کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کے حقیقی مفہوم بھٹو کے رازِ تاشقند کی طرح صدر صاحب کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اور جب اُن کی صراحت کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ وقت آنے پر سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ دوسری طرف تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کو کالعدم کر کے اُن کے قائدین کی کردار کشی کرائی جا رہی ہے۔ تیسری جانب اخبارات جن کو اس دور میں ریاست کا چوتھا ستون سمجھا جاتا ہے ان کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے اور عدالتوں کے تمام اختیارات مارشل لا کے مقابلے میں اور دوسرے اہم قومی معاملات میں بالکل محدود کر دیئے گئے ہیں اور چوتھی مصیبت

---

[۱] حال ہی میں کالعدم جماعت اسلامی پاکستان کی مجلسِ ادارت کا انعقاد قائد تحریکِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کی صدارت میں ہوا۔ مجلس میں غور و بحث کے بعد موجودہ حالات کے متعلق ایک تفصیلی قرارداد پاس کی گئی جس کا متن ۱۳؍ اپریل کو منصورہ سے اخبارات کو جاری کیا گیا۔ اس کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر اسے ترجمان القرآن میں دیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

یہ ہے کہ اس ضعف و بحران سے فائدہ اٹھا کر ملحدوں، سوشلسٹوں، قادیانیوں، لادین جاہ پرستوں، امریکہ اور روس کے گماشتوں، صوبائیت کے علمبرداروں، علیحدگی پسندوں، وڈیروں، جاگیرداروں، صنعت و تجارت کے اجارہ داروں اور فرنگیت زدہ اور دین سے معرکہ آرائی کرنے والی خواتین نے اپنے اپنے اڈے نہایت مضبوط کر لیے ہیں۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ ایسی تمام تخریبی قوتوں کو اُبھارنے، آگے بڑھانے اور ان کی سرپرستی کا کام حکومت ہی مختلف تدبیروں سے کر رہی ہے۔

پھر ستم یہ کہ اس مارشل لاء نے اپنے دور کا آغاز تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اس اعلان کے ساتھ کیا کہ وہ پاکستان قومی اتحاد (سابقہ) کے عزائم کے مطابق ملک میں اسلامی نظامِ زندگی (نظامِ مصطفےٰ ﷺ) نافذ کرے گا۔ جس کا قومی رہنماؤں اور علماء اور خواص و عوام سب نے خیر مقدم کیا اور اس کے بعد جب کچھ اسلامی احکام کا نفاذ اور بعض اسلامی اداروں کا قیام بھی عمل میں آیا تو عوام میں مزید اطمینان پیدا ہوا۔ لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کے مصداق یہ سارا عمل بہت محدود اور بڑی حد تک نمائشی ثابت ہوا، کیونکہ یہ "نفاذ اسلام" عملاً جو نتائج سامنے لایا ہے وہ ہر قسم کے جرائم اور غنڈہ گردی میں اضافے، قومی شاہراہوں اور شہروں کے بھرے بازاروں میں ڈاکے، کھاتے پیتے گھرانوں کے افراد اور بچوں کے اغوا، اور معصوم بچیوں کو ملک سے باہر لے جا کر لونڈیوں کی طرح بیچے جانے، لوگوں کے گھروں میں گھس کر خواتین کے ناموس کو لوٹنے، رشوت کے ریٹ میں کئی گنا اضافے، حوالاتوں اور تھانوں میں جلا دی، عورتوں کے بینا بازاروں میں مردوں کی چہل پہل، زنانہ کوروں کی مرد کمانڈروں کے ذریعے ٹریننگ اور ان کی اپنی خواتین افسروں کی بجائے مردوں کے ہجوم میں صدر، گورنر اور فوجی اکابر کو سلامیاں، شادیوں پر بے پناہ اسراف و تعیش کے مظاہرے اور ان تقریبات میں حکومت کے اکابر و عمائد اور اُن کی بیگمات کی شرکت، ٹی وی کے ذریعے بے حجابی اور مخلوط معاشرہ کی ترویج و فروغ، جابجا وی سی آر پر جنسی بے راہ روی کی چاٹ لگانے والی فلموں اور مناظر کی روز افزوں نمائش، شراب اور رقص و سرود کے کھلے بندوں دور، کتوں کی دوڑوں جیسے مشاغل کو فروغ، اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے، عوام کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں کے تحت فراعنۂ مصر کے لونڈی غلاموں کی طرح بے بس بنا دینا، معیشت کے بڑے حصہ کا سرمایہ پرستی،

استحصال اور سُود کی نذر ہو جانا، نام نہاد انتہائی کمزور سی زرعی اصلاحات کے قانون تک کو نافذ کرنے سے احتراز، ٹریفک کے حادثات میں روز افزوں اضافے اور شاہراہوں کا معصوم انسانوں کی قتل گاہیں بن جانا، غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی کو بے مصرف وزیروں اور اعلیٰ افسروں کی بھاری تنخواہوں، خوبصورت اقامت گاہوں اور دیگر مراعات کی نذر کر دینا؛ کھُلی کچہریوں کے ڈرامے جہاں پولیس فریادیوں کو غضبوں کے سامنے سرکارِ اعلیٰ کے سامنے پیش کرتی ہے، لیکن اگر ان کی اجازت کے بغیر کوئی آگے بڑھ جائے تو اس کا اسی محافظِ عوام پولیس کے ہاتھوں سنگین نتائج سے دوچار ہونا —— ایسی صورت حال ہے جس کی موجودگی میں ایسے معاشرے اور حکومت پر اسلام کا لیبل لگا دینا اسلام کے ساتھ صریح زیادتی ہے۔

مختلف اہل ایمان و شعور اور خود ہماری طرف سے نفاذِ اسلام کے لیے اس امر کی نشان دہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی کہ اس کام کو ایک مضبوط با عمل ٹیم کے بغیر کبھی انجام نہیں دیا جا سکتا — اس کے لیے ایک باقاعدہ اور مفصل ترجیحاتی منصوبے کی ضرورت ہے اور کلیدی مناصب سے مخالف اسلام نظریات کے حامل اور اُوپر سے آمدہ احکام پر عمل کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کو ان مناصب سے ہٹا کر ان کی جگہ با عمل و باایمان محبِ اسلام آدمی مقرر کرنا ضروری ہے۔ اہلِ دین کے ان مشوروں کو کوئی وقعت دینا تو درکنار، حکومت نے خود جن اداروں کو نفاذِ اسلام کی خاطر قائم کیا تھا، ان کی بھی بیشتر رپورٹیں سرد خانے میں منجمد پڑی ہیں اور حکومت نے از سرِ نو اپنے حسبِ منشا سفارشات حاصل کرنے کے لیے اپنے کسی دوسرے پسندیدہ ادارے کے سپرد کر دیا ہے، اور فیڈرل شریعت کورٹ کے فیصلوں تک کو دستوری تقاضوں کے مطابق سیدھی طرح قبول کرنے کی بجائے ان کو چیلنج کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس وقت حکومت کے طرزِ عمل اور عزائم کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صدر صاحب نے اب یہ دعویٰ فرما دیا ہے کہ اقتدار ان کو اللہ کی طرف سے تفویض ہوا ہے[۵]۔ گویا کہ وہ "ظلِ الٰہی" بن کر جو چاہیں فیصلہ فرما سکتے ہیں۔ جنرل ایوب خان کے

---

۵ ہر دَور کا ہر حکمران اس طرح کا دعویٰ کر کے اپنے لیے فوق الانسانی مقام بنا سکتا ہے، جس سے نہ اختلاف کیا جا سکے اور نہ تنقید روا ہو۔ (ادارہ)

آخری ایام میں یہی خیال قادیانیوں نے ایوب خان کے دماغ میں بٹھا دیا تھا کہ ان کا ہر فیصلہ الہامی ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے پہلے تاریخ میں اس زعم میں مبتلا ہونے والوں کا کیا انجام ہوا۔ صدر صاحب یہ بھول رہے ہیں کہ اللہ کا کسی کو اقتدار پر لا بٹھانا ایک سخت آزمائش ہوتا ہے۔ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دو آدمیوں پر بھی حکم بنا گیا گویا اسے بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔ (او کما قال)

اس وقت صدر صاحب کو ایسے فوجی اور سول مشیر گھیرے میں لیے ہوتے ہیں جو بظاہر بڑی خوشنما اور دل کش تجاویز اور سکیمیں اور پالیسیاں تیار کر کے ان کو دے رہے ہیں جن کے ذریعے صدر صاحب کے اسلامی ہاتھوں کے ذریعے قوم کو پوری طرح جبریت کے آہنی فسطائی شکنجے میں جکڑ لیا جائے۔

ایم آر ڈی اور وکلا کی تحریکوں کو کچل دینے کے بعد مطلق العنانی کی عادی انتظامیہ کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ چنانچہ اب انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ پر ان کے اس قصور پر ہلہ بول دیا ہے کہ اس گروہ طلبہ نے تعلیم گاہوں میں ان کے عشرت کدوں اور رنگ رلیاں منانے کے اڈوں کو اجاڑ کر ان کی جگہ درس قرآن و حدیث اور سیرت و میلاد کی محفلیں قائم کر دی ہیں اور طلبہ و طالبات کو ان کی عیاشیوں کا سامان بننے سے روک دیا ہے۔ یہ فضا انہوں نے بہت سی جانوں تک کی قربانیاں دے کر پیدا کی اور تعلیم گاہوں میں نظم و ضبط اور باقاعدگی کو فروغ دیا۔ یہاں تک کہ گذشتہ دو تین سالوں سے یونینوں کے انتخابات بھی پُرامن ماحول میں ہونے لگے۔ اب اس کے بعد یکایک بے ہنگم طور پر محض اس وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا گیا کہ اسلامی جمعیت طلبہ روز بروز ایک منظم اور مضبوط قوت بنتی جارہی ہے اور راستے سے ہٹا کر نہ صرف حکومت کی آنے والی پُراسرار سیاسی اسکیم کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا، بلکہ ملحدوں، قادیانیوں اور امریکہ اور روس تک کی خوشنودی بھی زیادہ آسانی سے حاصل ہو سکے گی۔

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اسلامی جمعیت سے تعلق رکھنے والے طلبہ جو بڑی سے بڑی آزمائش کے موقع پر بھی معقول اور محتاط طریقوں سے صدائے احتجاج بلند کرنے کا مزاج رکھتے تھے، ان

کے ساتھ جگہ جگہ نہایت بہیمانہ سلوک کیا گیا ۔ عام غنڈوں اور بدمعاشوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینے والی پولیس نے ان طلبہ اور ان کے والدین کے ساتھ مختلف مقامات پر جو شرمناک سلوک کیا ہے اس کے متعدد کھلے شواہد موجود ہیں، لیکن صدر مملکت جن پر مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے اس کی براہ راست ذمہ داری آتی ہے، انہیں محض افواہیں قرار دے کر زخموں پر نمک چھڑکنے کی کوشش فرماتے ہیں ۔ کتنا ظلم ہے کہ ملک کی شرعی اور عام عدالتیں قانون کو پاؤں تلے روندنے کے ان واقعات کا نوٹس تک لینے کا اختیار نہیں رکھتیں ۔ اور نہ اخبارات ان واقعات و احوال کو شائع کر سکتے ہیں۔[1] اس رویے کا ردّ عمل یہ ہوا کہ انتہائی امن پسند اور منضبط و منظم اور با اخلاق قسم کے نوجوان بھی بعض اوقات وہ کچھ کر گذرے جس کو وہ خود بھی ناپسند کرتے ہیں ۔

اسی صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ اب سارے ملک میں یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ ہم ایک ایسے دَورِ ظلم و تشدد میں داخل ہو گئے ہیں جس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اس انداز میں کیا گیا تھا کہ سارے پاکستان بلکہ عالم اسلام میں اسلامی نظام حیات کے آغاز کی اُمید پیدا ہو گئی تھی ۔ آج اس دعوائے اسلامیت کا طلسم ٹوٹ چکا ہے ۔ اب حکومت سے یہ توقع بھی ختم ہو رہی ہے کہ وہ اُلجھنوں کو سلجھانے کے لیے معقولیت اور اہل وطن سے افہام و تفہیم کی راہ اختیار کرے گی

انسانی تاریخ کے ہزارہا واقعات اور خود پاکستان کے اپنے تجربات گواہ ہیں کہ جب کسی حکومت کے پاؤں تلے سے زمین سرکنے لگتی ہے تو وہ ظلم و استبداد پہ اُتر آتی ہے اور پھر

---

[1] کیا یہ راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی جج کی سربراہی میں ایک قابلِ اعتماد دینی شخصیت، ایک قومی لیڈر ایک سلیم الطبع اعلیٰ استاد اور طلباء مظلوم کے ایک نمائندے پر مشتمل کمیشن بنایا جائے اور تمام مظلوم طلبہ کو موقع دیا جائے کہ اپنے اُوپر گذرنے والے حالات کو کھل کر ایسے پبلک کمیشن کے سامنے بیان کریں اور پھر ہر ایسے سرکاری کارندے کو قانون کی گرفت میں لیا جائے جس نے کوئی غیر قانونی زیادتی کی ہو یا اس کا حکم دیا ہو یا جانتے بوجھتے غلط حرکات کی روک تھام نہ کی ہو۔

(ادارہ)

اس کا یہی استبدادی طرزِ عمل اُسے لے ڈوبتا ہے اور اچانک وہ گھڑی آجاتی ہے جس سے بچنے کے لیے جبریت کے ذریعے بند باندھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

اس وقت ملک و ملّت کے سامنے درج ذیل مسائل ہماری نظر میں سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور پوری قوم کو ان پر یکسو ہو کر پاکستان کے تحفظ کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

۱ ـــ تصورِ اسلام کے بارے میں جو ذہنی انتشار، فکری ژولیدگی، قول و عمل کا تضاد، اسلامی احکام سے کھلا کھلا فرار راہ پا گیا ہے اُسے ختم کرنا ہے اور قرآن و سنت کے دیئے ہوئے نظامِ زندگی پر قوم کو متحد اور یکسو کرنا ہے۔ اس بارے میں ہمارے لیے اصلی نمونہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور آپ کا قائم کیا ہوا وہ نظام ہے جس کی خلفائے راشدین نے پیروی کی اور اُسے آخری دم تک قائم رکھنے کی کوشش کی۔ اس پر اُمت کا اجماع ہے اور یہی ہماری وحدت اور طاقت کا ضامن اور سربلندی کا ذریعہ ہے۔

۲ ـــ مارشل لا کے لامتناہی دَور کو ختم کرنا اور اس نظامِ جبر و ظلم کے آگے بند باندھنا ہے جو اب اِس ملک پر اپنے منحوس سائے پھیلا رہا ہے اور ملک کے استحکام و سالمیت اور یک جہتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ ماضی میں کچھ بالاتر مقاصد کے لیے ایک حد تک مارشل لا گوارا کیا گیا، مگر اب اس کا جاری رہنا اس ملک کے وجود و بقا اور اسلام کے نظام کے قیام کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ۱۲ راگست ۱۹۸۳ء کے اعلان کو اس کے لیے آخری مہلت کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ اور اب کسی کو اسے مزید طول دینے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ مارچ ۱۹۸۵ء تک انتقالِ اقتدار کے لیے ۱۹۸۴ء کے اندر اندر مرکزی اور صوبائی انتخابات ہو جانے چاہئیں اور نئے مسئلوں کو اُٹھا کر اس سے فرار کا ہر راستہ بند کیا جانا ضروری ہے۔

۳ ـــ ایسی سیاسی فضا کا قیام جو خلفشار اور تصادم کے مقابلے میں افہام و تفہیم کے ذریعہ انتخابی مرحلہ کو ممکن بنا دے اور بنیادی اُصولوں پر کسی مصالحت کے بغیر مارشل لا سے نجات کی کوئی معقول راہ استوار ہو سکے۔ اس سلسلہ میں ان تمام فتنوں سے بچنے اور قوم کو ان سے بچانے کے لیے مؤثر کوششوں کی ضرورت ہے، جو گروہ بندی، فرقہ واریت، باہمی دشنام طرازی

سیاسی عناصر کے درمیان تلخی، عوام اور حکومت کے درمیان تصادم اور ملک میں تشدد اور خلفشار کو کسی بھی شکل میں اُبھارنے کا ذریعہ بنیں۔ ایسی کوششیں انتخابات کے انعقاد اور جمہوریت کی بحالی کی راہ روکنے اور مارشل لا کو نئی زندگی یا نیا چہرہ دینے کے لیے ہی کی جا رہی ہیں اور آگے ان میں مزید اضافہ کیے جانے کا خطرہ ہے۔

تحریک اسلامی ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کرے گی۔ واللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و رہنمائی میں اس راستہ پر چل کر انشاء اللہ تعالیٰ بالآخر پاکستان کو اسلام اور حقیقی جمہوریت کا گہوارہ بنانے کی سعی کرے گی۔ اس نے ماضی میں ان مقاصد کے لیے جب بھی ضرورت پیش آئی ہے دوسروں سے مل کر مشترک جدوجہد کی ہے، اور مستقبل میں بھی دین و ملک کے مفاد میں اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ایسی مساعی کا دروازہ کھلا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس جدوجہد میں پوری قوم اور اس کے تمام با اثر عناصر شریک ہوں اور اسلام کی بنیادوں پر ایک حقیقی جمہوری نظام کے قیام کے لیے سب اپنا اپنا رول ادا کریں۔ اس کے لیے ایک ایسے ضابطۂ اخلاق کا اہتمام لازم ہے جس کے تحت ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے کی بجائے تمام سیاسی اور دینی عناصر مشترک مقاصد کے لیے افہام و تفہیم اور تعاون کی فضا پیدا کریں۔

یہ کام ذاتی، علاقائی، نسلی اور گروہی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر خالصتاً اسلام اور ملک کے مفاد میں انجام پانا چاہیے۔ اختلافات کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق تمام سیاسی اور دینی عناصر کو اپنے اپنے رویّہ کا خود جائزہ لینا چاہیے۔ اور اختلاف و اعتراض کو اخلاقی حدود کے اندر رکھتے ہوئے تعاون و اشتراک کا آپس میں عہد کرنا چاہیے اور مشترک مقاصد اور اہداف کے حصول کے لیے ممکن حد تک تعاون کی فضا قائم کرنی چاہیے۔ ہم نے ۱۹۸۲ء میں میثاقِ ملّی پیش کر کے عملاً اس کی ابتدا کی تھی اور اب پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں۔ اگر ہر گروہ اپنے اپنے طریقے پر اور اپنے اپنے دائرہ اثر میں اپنے ہی انداز میں ان مشترک مقاصد کے لیے کام کرے تب بھی حالات کو سدھارنے کی طرف مثبت پیش قدمی ہو سکتی ہے

ملک میں اسلام اور جمہوریت کی راہ میں حائل قوتوں کو ہم کوئی چیلنج دیے بغیر یہ ضرور کہنا چاہیئے

ہیں کہ پہلے بھی بار بار اسلامی تحریک، دوسری اسلامی قوتوں اور عناصر اور اسلامی رجحانات کو اس ملک میں نشانۂ ستم بنانے کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور ایسے تجربے کے نتیجے میں ظلم و جبر کرنے والی قوتیں گردن کے بل گریں اور خدا کے فضل سے اسلامی قوتیں پہلے سے زیادہ توانا ہو کر اُبھریں۔ اب بھی اگر خدا کے دین کی سربلندی کے لیے کوچہ بہ کوچہ کام کرنے والے بے لوث خادموں کو کوئی قوت کچلنا چاہتی ہے تو امریکہ و روس اور قادیانیوں اور سوشلسٹوں کی پشت پناہی کے باوجود اسلام کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی۔

یہ سرزمین مسلمانوں نے اسلام کے لیے حاصل کی ہے اور یہاں بالآخر خدا کا دین اور اسلامی نظامِ زندگی ہی اپنی صحیح شکل میں جلوہ گر ہوگا اور اس کی روشنی چار دانگِ عالم میں پھیلے گی اور ان شاء اللہ دنیا کی کوئی قوت اسلام کی اس عالمگیر تحریک کا راستہ نہ روک سکے گی۔

داعیانِ حق اور دین کے علمبرداروں کو بھی یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ دورِ ظلم و استبداد کے خاتمے کا سب سے کارگر نسخہ ظلم و ستم کو صبر و تحمل سے سہہ کر اور ہر قربانی دے کر راہِ اعتدال پر قائم رہنا اور راہِ حق و ثواب سے نہ ہٹنا ہے۔ راہِ حق میں کامیابی کا یہ ہمارا آزمودہ نسخہ ہے اور آئندہ بھی ہم ظلم کی یلغار کو ان شاء اللہ انہیں ہتھیاروں سے روکیں گے۔ اس کام میں تمام اہلِ خیر کا تعاون بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ہم اس کے خواستگار ہیں۔ ہماری ساری جدوجہد مرض کے خاتمہ اور مریض کی صحت یابی کے لیے ہے۔ ہم ہر اس قوت کے حریف ہیں جو ظلم اور اللہ سے بغاوت کے راستے پر گامزن ہو اور ہر اس قوت کے دوست اور بہی خواہ ہیں جو حق کی پرستار اور دینِ اسلام کے قیام کی راہ میں معاون بن سکتی ہو۔ حتیٰ کہ کل کے ظالم اور خدا سے سرکش بھی اگر ظلم اور سرکشی کی روش ترک کر کے مقاصدِ پاکستان کے حصول میں تعاون کے لیے تیار ہوجائیں تو وہ بھی اس قافلے کے ہمسفر اور ہم راہی بن سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ملک میں جمہوریت کا قیام ملک کی بقا و سلامتی اور اسلامی نظام کے قیام کی بنیادی ضرورت ہے۔ البتہ ہم جمہوریت کا ڈرامہ نہیں بلکہ صحیح جمہوریت کا قیام چاہتے ہیں۔ ہم ۱۹۷۳ء کے دستور کی بنیاد پر منصفانہ انتخابات کا انعقاد چاہتے ہیں۔ ہم ظلم و استحصال،

لینڈ لارڈ ازم اور وڈیرہ شاہی کا خاتمہ اور غریبوں کے تمام مصائب و مشکلات کو حل کرنا چاہتے ہیں ۔ ہم فحاشی، عیاشی اور بدمعاشی کی جڑیں کاٹ دینا چاہتے ہیں ۔ ہم حکمرانی کے عمل کو بیوروکریسی اور فوج کے تسلط سے نکالنا چاہتے ہیں ۔ ہم رشوت و خیانت اور ظلم و تشدد کا انسداد چاہتے ہیں ۔ ہم افغان مہاجرین کی کامیابی اور مہاجرین کی باعزت واپسی چاہتے ہیں اور انہی تمام مقاصد کے حصول کے لیے ہم اسلامی نظام کو پوری اور صحیح صورت میں استوار کرنا چاہتے ہیں ۔ اس میں جو ہمارے ساتھ آئے تو دنیا میں عزت اور آخرت میں اجر پائے گا۔ نہ آئے تو خدا ہمارے ساتھ ہے اور الحمد للہ ہم اپنے سارے کام اپنے ہاتھوں کرنے کی مشق رکھتے ہیں ۔ وما توفیقنا الا باللہ ۔

الفاتحۃ اُمّ الکتاب

از میر محمد حسین - ایم - اے (فاضل دیوبند)

اس سورت کے مکّی یا مدنی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ ابو العالیہ اسے مکّی بتاتے ہیں جب کہ حضرت ابوہریرہ، مجاہد، عطا بن یسار اور زہری اسے مدنی خیال کرتے ہیں۔ جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے، وہ اتنا متوازن اور معتدل ہے کہ اس بنیاد پر کسی ایک رائے کو ترجیح دینا بہت مشکل ہے۔ خارجی شہادتوں کی بنیاد پر اگرچہ ہمیں —— جیسا کہ علامہ قرطبی نے کہا ہے اس کا مکّی ہونا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ سورۃ الحجر (جو بالاتفاق مکّی ہے) میں نبی علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ اور ائمہ تفسیر کا اس بات پر تقریباً اجماع ہے کہ سبع مثانی اور قرآن عظیم سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔ نیز مکّہ میں اوّل روز سے نماز ادا کی جا رہی تھی اور حضور کا ارشاد ہے کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب اس سے لازم آتا ہے کہ سورۂ فاتحہ اس وقت مکّہ میں نازل ہو چکی ہو۔

تاہم سورت کو اس کے مفہوم و مدّعا کے لحاظ سے اگر بیک مکّی و مدنی کہا جائے تو بھی یہ رائے بہت وقیع ہو گی کیونکہ مضامین کے لحاظ سے سورت کے چار حصّے کئے جا سکتے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف اس کے چار صفاتی ناموں —— رب العالمین، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین —— کے ساتھ۔

۲ ــ بندے کا اقرار و اعلان کہ وہ صرف اور صرف اسی کی عبادت کرے گا اور صرف اسی سے ہر طرح کی اعانت و مدد طلب کرے گا۔

۳ ــ اس صراطِ مستقیم پر چلنے کی دُعا جو انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے۔

۴ ــ گمراہ اور غضب کا شکار ہونے والوں کی راہ سے بچنے کی دُعا۔

اور قرآن مجید کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی باقی تمام صفات انہی چار بنیادی صفات کا عکس و مظہر یا لازمہ و تتمہ ہیں۔ دوسری چیز جس پر قرآن مجید میں زور دیا گیا ہے وہ توحید ہے جس کا دو لفظوں میں خلاصہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ اور اپنی حاجات و ضروریات کے لیے صرف اور صرف اسی سے مدد مانگی جائے۔ اسی طرح قرآن مجید میں چار ہی قسم کے لوگوں کو خدا کا منعم علیہ بتایا گیا ہے، انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین اور انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے جب کہ باقی جن افراد و اقوام ـــــ ہود، صالح، شعیب اور لوط علیہ السلام کی قوموں، بنی اسرائیل اور نصاریٰ ـــــ کا ذکر ہے۔ وہ سب کی سب مغضوب اور گمراہ بتائی گئی ہیں، جن کی راہ کو خسارے اور ناکامی کی راہ بتایا گیا ہے۔

اِسی طرح یہ سورت پورے قرآن کی تمہید و دیباچہ یا متن بھی ہے جو شروع میں آیا کرتا ہے اور اس کا خلاصہ و اختصار بھی جو آخر میں دیا جاتا ہے۔ سورت کے اس معجزانہ پہلو کو دیکھا جائے تو اسے بیک وقت مکی بھی کہا جا سکتا ہے اور مدنی بھی۔

خلاصہ و اختصار ہونے کی صورت میں تو ظاہر ہے کہ اس کتابِ حکیم کے مطالعہ کے بعد جو احساس و تاثر قاری کے دل پر قائم ہونا چاہیے۔ وہ رب العالمین کی حمد و ثنا، اقرار و اعلانِ بندگی اور دُعائے ہدایت و رہنمائی کی صورت میں اسے تلقین کر دیا گیا تاکہ وہ اسے عمل میں لا کر یوم الدین کی پرستش سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکے۔

اور اگر اسے تمہید و متن قرار دیا جائے تو یہ اُس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ ایک خالی الذہن اور سلیم الفطرت انسان جب اپنے اِرد گرد شش جہات میں پھیلی ہوئی کائنات پر غور کرتا ہے تو وہ نہ صرف اس کی ریاضیاتی اُصولوں پر مبنی اور پُر از حکمت تخلیق پر حیران و ششدر

رہ جاتا ہے، بلکہ اس کے بنانے والے کی ربوبیت اور بے پایاں رحمت پر بے اختیار تعریف و توصیف بھی کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اس نے صرف اس خلاصۂ کائنات ــــــ انسان ــــــ ہی کی جسمانی و رُوحانی نشو ونما اور ارتقا کے لیے ہر طرح کا ساز و سامان، زمینوں اور آسمانوں میں ودیعت نہیں کر دیا بلکہ دوسری تمام مخلوقات ــــــ حیوانات، نباتات اور جمادات ــــــ تک کے نشو ونما اور ارتقا کے جلی و خفی اسباب مہیا کر دیے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اتنا بڑا کھکیڑ محض کھیل اور نمائش کے لیے نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کا لازماً کوئی مقصد و مدعا ہوگا اور وہ اس شعور و اختیار کامل رکھنے والی مخلوق ــــــ انسان ــــــ کے جذبۂ تشکر و امتنان کی آزمائش کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے چنانچہ وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے۔ ایاک نعبد کہ "اے رب کائنات! ہم تیری اس بے پایاں رحمت پر مبنی ربوبیت کے سامنے اپنا سر نیازمندی خم کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم دُنیا میں تیرے ہی بندے بن کر رہیں گے"۔

رب کائنات کا وجود غور و فکر سے پہلے غیاب و حجاب میں تھا۔ تدبر و تفکر کے نتیجہ میں اب گویا اس کے لیے مشہود و محسوس بن گیا ہے۔ اس لیے اب وہ اس سے بصیغۂ خطاب مخاطب ہوتا ہے۔

چونکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جس رب العالمین نے انسان کی تمام مادّی و رُوحانی ضرورتوں کا پہلے سے بندوبست کر رکھا ہے وہ اس کی آئندہ ضرورتوں کو بھی لازماً کفیل ہوگا اس لیے معاً اس کے دل سے یہ صدا بھی اُٹھتی ہے کہ ایاک نستعین کہ "اے ربِ کائنات! ہم تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنی تمام حاجات اور آرزوؤں کے لیے صرف اور صرف تجھی سے اعانت و مدد کے طلب گار ہوں گے"۔

ان دو جملوں میں اگرچہ حصر موجود ہے جس سے ماسوی اللہ کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے مگر بالصراحت غیر اللہ کی نفی نہ کرنے میں حکمت یہ نظر آتی ہے کہ کائنات کا مطالعہ کرنے والے سلیم الفطرت انسان کا مطالعہ اُسے جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے، وہ صرف رب العالمین کے لیے

اپنی بندگی اور صرف اسی سے استعانت کا اظہار رہے جو اگرچہ نفی ماسوٰی کو متضمن ہے تاہم ابھی اس کا ذہن کسی ماسوٰی اللہ کی طرف بالقصد متوجہ نہیں۔ اس لیے اس کی بالصراحت نفی کی ضرورت نہ تھی۔ توحید انسان کی فطرت کی آرزو ہے۔ شرک کی آمیزش بعد میں اور خارجی عوامل کی وجہ سے ہوئی۔ اس لیے اس کی نفی اور تردید کی ضرورت بھی بعد میں پیش آئی۔

یہاں تک رب العالمین سے انسان کی وابستگی ذہنی و فکری حد تک تھی، لیکن اسے معلوم ہے کہ عمل کی دنیا میں بہت سی ترغیبات و مشکلات ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو اسے بندگی کی اس راہ سے ہٹا دیں یا اُسے اس عہد سے منحرف کر دیں یا اُسے فکر و ذہنی اُلجھن میں ڈال دیں جیسا کہ تاریخ میں ہو چکا ہے، اس لیے معاً بعد اس سے یوں عملی استعانت کرتا ہے کہ وہ اُسے ہمیشہ صراطِ مستقیم پر چلتا رکھے، جس پر اے ربِ کائنات! تیرے بندے چل کر انعام یافتہ ٹھہرے اور عملی و فکری گمراہیوں سے محفوظ رہے اور پھر اس رحمٰن و رحیم رب العالمین نے فوراً جواب دیا کہ وہ صراطِ مستقیم ہماری یہ کتاب ہے، جس کے ہدایت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں (البقرہ) صیغۂ جمع میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ صدا پوری نوعِ انسانی کی فطرتِ سلیمہ کی صدا ہے۔

قرآن مجید میں رحمٰن و رحیم ہر دو الفاظ کے استعمال کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ لفظ رحمٰن اپنے مبانی (حروف) کی کثرت کی طرح اپنے معانی میں بھی وسعت لیے ہوئے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی اس وسیع رحمت کے لیے استعمال ہوا ہے جو تمام انسانوں —— قطع نظر اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مومن —— پر محیط ہے اور جس کے بغیر انسان، نہ انسان ہو سکتا تھا اور نہ وہ اس کے بغیر زندہ رہ سکتا تھا یا اس کائنات میں ترقی و ارتقاء کے منازل طے کر سکتا تھا۔ اس وسیع رحمت سے مراد رب العالمین کی عطا کردہ وہ تمام مادّی ذہنی اور روحانی نعمتیں ہیں جو اس نے انسان کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلا رکھی ہیں قرآن مجید میں جابجا ان کا حوالہ دے کر انسان کو اس کے انکار، اس سے بغاوت یا اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے سے باز رہنے کو کہا گیا ہے۔

قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے ظاہر ہوگا کہ لفظ رحیم نسبتاً محدود معنوں میں استعمال

ہوتا ہے اور عموماً اس سے مراد خدائے کائنات کی وہ رحمت لی جاتی ہے جس کی بدولت وہ انسان کو اس کی بغاوت و سرکشی سے باز آجانے پر معاف کر دیتا یا اس کے ساتھ رویّہ درست ہونے پر انسان کی لغزشوں یا مجبوریوں سے درگذر کرتا، اسے سہولتیں بہم پہنچاتا یا اس کی سرکشی کے باوجود اس پر فوراً گرفت نہیں کرتا، بلکہ اسے مہلت اور ڈھیل دے دیتا ہے۔

سورۃ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد صفت الرحمٰن کا ذکر کرنے سے انسان پر یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس رب العالمین نے اپنی گوناگوں مخلوق کی تخلیق، اس کے بقا کی تمام ضروریات اور اس کے ارتقاء کے تمام لوازمات جو مہیا کیے ہیں تو محض اپنی رحمت واسعہ و عامہ کی وجہ سے کیے ہیں۔ یہ کسی کا استحقاق یا کسی کی کاوش کا ثمرہ و نتیجہ نہیں۔

ساتھ ہی اپنی رحمت کے ایک دوسرے پہلو کی طرف لفظ الرحیم لا کر اشارہ فرما دیا کہ بہر حال آفرینش کا یہ سلسلہ بے مقصد و مہمل نہیں، بلکہ اس کی ایک غرض و غایت ہے اور وہ انسان کے جذبۂ تشکر و امتنان کا امتحان ہے۔ اگر انسان نے اس کا ثبوت دیا تو ان دُنیوی نعمتوں کے علاوہ وہ اسے اُخروی نعمتوں سے بھی نوازے گا۔ اور اس کی خوشنودی و رضا اس پر مستزاد ہوگی اور اگر اُس نے بغاوت و ناشکری کی راہ اختیار کی تو اُسے توبہ و اصلاح کا موقع بھی مہیا کیا جائے گا، لیکن اس کی مہیا کردہ ان تمام سہولتوں، آسائشوں اور تنعمات سے فائدہ اُٹھانے کے باوجود اگر وہ اپنی باغیانہ روش پر اڑا رہا تو پھر اُسے یومِ جزا کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ پوری طرح اس کی گرفت میں ہوگا اور اُسے اپنی اس روش کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔

سورت کا مرکزی مدعا و مفہوم خدا کے نیک بندوں کی راہ پر چلنے کی آرزو و تمنا ہی ہے، جس کا اظہار بندہ اپنے رب کے انعامات کی اُمید اور اس کی گرفت و عتاب کے خوف کے ساتھ نہیں، اپنی اسی کے ساتھ وابستگی کے اقرار و اعلان کے بعد کرتا ہے کیونکہ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے باوجود ایک مسلمان کو روزمرّہ کی زندگی میں ——— گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی ——— ہر روز ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں

اگر خدا کی دستگیری حاصل نہ ہو تو وہ کسی بھی وقت راہ راست سے بھٹک سکتا ہے۔ ہر نماز میں اس دُعا کے اعادہ و تکرار کی یہی حکمت و علم معلوم ہوتی ہے۔

سورت جہاں اپنے مضامین و مشتملات کے اعتبار سے بایں معنٰی معجزہ ہے کہ پورے قرآن میں پھیلے ہوئے تمام مضامین اس میں سمٹ آئے ہیں، وہاں اپنے الفاظ، ان کی بندش اور اسلوب کے لحاظ سے اس نوعیت معجز کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں وارد تقریباً ۲۶ الفاظ میں سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو عربی اور اردو ہر دو زبانوں کے روزمرہ میں استعمال نہ ہوتا ہو اور جس کے مفہوم میں کسی قسم کا اشکال و اغلاق یا پیچیدگی ہو مگر اس کے باوجود ان الفاظ سے اتنا حسین و جمیل، سہل اور جامع کلام ترکیب دینا جو ایک پوری کتاب کے مضامین کو اپنے اندر سموے، انسانی استطاعت سے باہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ کی حیثیت ایک تخم اور بیج کی سی ہے اور باقی سارے قرآن کی ایک شجرۃ طیبہ کی سی۔ جس طرح درخت کی ابتدا ایک بیج سے ہوتی ہے اور پھر آخر میں اس پر لگتا بھی بیج ہی ہے، جس سے اس خلاقِ عالم کی شان ھویدا تی ربعید کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کا شجرۃ طیبہ پھوٹا بھی سورۃ فاتحہ سے ہے اور اس کی شاخ طوبیٰ پر بیج بھی اسی سورۃ فاتحہ کا لگا۔ اسی لیے اسے بجا طور پر ام الکتاب یا ام القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

فَلِلّٰہِ الحمد فی الاُولٰی والاٰخرۃ۔

حامدی صاحب کے تحریکی سفر کی داستان

(بہ شکل خطوط بنام قاری منہاج الدین صاحب)

از مولانا خلیل حامدی ڈائریکٹر ادارۂ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور

مصر کو روانگی

۲۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو چار بجے اسمرا سے ایتھوپیا ایئر لائنز کے ذریعے قاہرہ کی جانب چل پڑا۔ راستے میں ہمارا جہاز خرطوم ایئرپورٹ پر ۴۰ منٹ کے لیے ٹھہرا۔ اسمرا ایئرپورٹ سے اس جہاز میں چند سوڈانی بھی سوار ہوئے جو ابوظہبی میں ملازمت کرتے ہیں اور اب چھٹیاں گذارنے کے لیے وطن واپس آرہے تھے۔ اتفاق سے یہ لوگ جہاز میں میری سیٹ سے متصل دو رویہ سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ راستے میں یہ لوگ جہاز کے اندر بار بار شراب خرید کر پیتے رہے۔ شاید وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ سوڈان میں اب شراب دستیاب نہ ہوگی، لہٰذا اس امّ الخبائث کو دل بھر کر پی لیا جائے۔ خاکسار نے بے قابو ہو کر متصل بیٹھے ہوئے سوڈانی سے کہہ دیا۔ "آپ لوگوں کو اب سوڈان کے بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہو جانا چاہیے۔ سوڈان کو شراب سے پاک کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہی سوڈان کی دنیاوی بھلائی بھی ہے اور اخروی بھی۔" اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اور اپنے شغلِ ناپاک میں برابر مصروف رہا۔

دریائے نیل کے پیچ و خم

خرطوم میں جب جہاز اترا تو راقم ٹرانزٹ میں اتر کر یہ چند مختصر لمحات گذارنا چاہتا تھا، مگر جہاز والوں نے اترنے کی اجازت نہ دی۔ بہر حال اب جہاز قاہرہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں یہ جہاز جب نوبہ کے علاقے سے گذر گیا تو نیچے دریائے نیل کی گذرگاہ نظر آنے لگی۔ یہ مصر کا علاقہ ہے۔ مصر کی جتنی زرعی آبادی ہے وہ صرف نیل کے دونوں

کناروں پر آباد ہے۔ چنانچہ پورے راستے نیل نظر آتا رہا۔ اس نے کئی پیچ و تاب کھائے اور ساتھ ساتھ آبادی کی لکیریں بھی پیچ و تاب کھاتی رہیں۔ مصر کی یہی پٹی زرخیز و شاداب ہے۔ باقی مصر بڑی حد تک صحرا ہے۔ خرطوم اور قاہرہ کے درمیان ہوائی جہاز کے ذریعے کل دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ قاہرہ ایئرپورٹ پر کسی بڑی تاخیر کے بغیر ویزا اور کسٹم کے مرحلے گذر گئے۔ خاکسار ایتھوپیا ایئرلائنز کے حساب پر قاہرہ کے ایک ہوٹل میں جو مصر الجدیدۃ کے اندر واقع ہے، اُتر گیا۔ اب مجھے قاہرہ کے اندر ایک رات اور ایک دن گذارنا ہے۔ قاہرہ شہر سے مجھے اچھی طرح واقفیت ہے۔ بارہا یہاں کے گلی کوچوں میں گردش کی ہے۔

یاسر عرفات کی پُر ہنگامہ آمد

صبح اُٹھا تو قاہرہ میں یہ ہنگامہ برپا تھا کہ تنظیم آزادیٔ فلسطین کے سربراہ یاسر عرفات کا بحری جہاز سویز سے گذر رہا ہے اور یاسر عرفات اور صدر مصر حسنی مبارک سے اس کی ملاقات اور اس کے اعزاز میں دیگر تقریبیں منعقد ہو رہی ہیں۔ اخبارات بھی ان خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ اور مصری ریڈیو بھی اس موضوع پر دن بھر آنکھوں دیکھا حال سُناتا رہا۔ قاہرہ کے اندر ہر شخص کی زبان پر یہ کہانی تھی۔ پہلے اسماعیلیہ کے گورنر نے یاسر عرفات صاحب سے ان کے بحری جہاز کے اندر جا کر ملاقات کی اور پھر یاسر عرفات صاحب کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے اسماعیلیہ سے قاہرہ لایا گیا۔ اور صدر مصر سے ملاقات کرائی گئی اور پھر دونوں نے مل کر ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ یاسر عرفات نے اپنی تقریر میں مصر کے بارے میں ایک جملہ ایسا کہا جسے یہاں کے اخبارات نے خوب نمایاں شائع کیا۔ وہ جملہ یہ ہے ” العرب یتخبط بدون مصر“ (عرب مصر کے بغیر صرف ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں)

کتابوں کا چمن زار

خاکسار قاہرہ کے مشہور پارک حَدِیْقَۃُ الْاُزْبَکِیّۃ میں گیا۔ یہاں پارک کے ارد گرد کتابوں کی دکانیں ہیں۔ یہاں نسبتاً کتابیں سستی مل جاتی ہیں، اور بعض اوقات ایسی کتابیں بھی یہاں دستیاب ہو جاتی ہیں جو نادر ہو چکی ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ قاہرہ کے فکری اور ذہنی رجحانات کو معلوم کرنا ہو تو حدیقۃ الازبکیۃ کے مکتبوں کا جائزہ لے لیا جائے۔ یہاں کے مکتبے ان رجحانات کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں بالعموم وہ

کتابیں آتی ہیں جن کی مصری نوجوانوں کے اندر مانگ موجود ہوتی ہے۔ مکتبوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ اکثر کتابیں اسلام کے موضوع پر ہیں اور یا پھر ادب اور عمرانیات کے موضوع پر۔ امام حسن البنا، مولانا مودودی، سید قطب، محمد قطب، انورالجندی، متولی شعراوی اور دیگر مسلم مفکرین کی کتابیں ہر مکتبے پر نظر آئیں۔ ان کے ایڈیشن مصری تھے اور کاغذ ہلکا۔ اس لیے سستے بھی تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ کتابیں عام نوجوان خریدتے ہیں اور وہ زیادہ قیمت نہیں ادا کر سکتے۔ اس لیے یہاں عام رواج پانے والی اسلامی کتابیں بالعموم نسبتاً سستے کاغذ پر چھپتی ہیں۔ میری موجودگی میں چند باپردہ لڑکیاں ایک مکتبے پر آئیں۔ انہوں نے قرآن کریم کے کیسٹ اور سید سابق کی فقہ السنۃ اور چند دوسری کتابیں خریدیں۔ وہ نہایت وقار کے ساتھ آئیں اور ضرورت کی کتابیں خرید کر چلی گئیں۔ ان کے بعد کچھ لڑکے بھی آئے اور چند اسٹالوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے آگے نکل گئے۔

وہی نہ ملے! راقم قاہرہ کے بعض احباب سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ معلوم ہوا اخوان المسلمون کے رہنما استاذ عمر التلمسانی اور نامور اسلام پسند صحافی جابر رزق اور بعض دوسرے حضرات اس وقت قاہرہ سے باہر ہیں اور پاکستان اور امریکہ کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ اپنے ایک پرانے دوست استاذ اسعد السید کے مکتبہ دارالانصار کی طرف گیا۔ استاذ اسعد السید کا پچھلے سال انتقال ہوگیا تھا۔ ان کا مکتبہ اب ایک اور صاحب کھولتے ہیں، مگر آج جمعہ کی وجہ سے مکتبہ بند ہے۔

بے پردگی سے پردہ کی طرف قاہرہ بہت پرہجوم شہر ہے۔ دیہات سے لوگ اٹھ اٹھ کر قاہرہ کا رخ کر رہے ہیں۔ اب سڑکوں پر عریانی کے وہ مناظر کم ملتے ہیں جن کا چلن ۱۹۷۰ء تک زور و شور سے رہا ہے۔ لڑکیوں کی اچھی خاصی تعداد باپردہ نظر آتی ہے۔ البتہ یہاں کا پردہ یہ ہے کہ پورا جسم ایک ڈھیلے لباس میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اور چہرہ اور ہاتھ ننگے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بھی غنیمت ہے اس لیے کہ یہ معاشرہ بے پردگی سے پردہ کی جانب بڑھ رہا ہے۔ مسجدوں کے اندر بھی نوجوانوں کی تعداد بزرگوں سے زیادہ نظر آتی ہے۔

سیاسی جماعتوں کی بحالی کا مسئلہ راستے میں اتفاق سے صلاح ابو اسماعیل صاحب مل گئے۔

اُن سے پہلے بھی ایک بار ڈاکٹر عبدالودود شبلی صاحب کے ذریعے ملاقات ہوئی تھی - یہ مصر کی پارلیمنٹ (مجلس الشعب) کے رکن ہیں - یہ بڑے باہمت انسان ہیں، عالم دین ہیں۔ خیر و عافیت کے بعد بتانے لگے کہ آجکل یہاں پارلیمنٹ میں سابقہ سیاسی جماعتوں کی بحالی کا مسئلہ زیر بحث ہے - ایک پارلیمانی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو اس مسئلے پر اپنی رپورٹ پیش کرے گی اس کمیٹی کے صدر ایوانِ بالا کے صدر صبحی عبدالحکیم ہیں۔ اس وقت دو جماعتوں کی درخواستیں زیر غور ہیں ایک نحاس پاشا مرحوم کی وفد پارٹی کی درخواست جسے نحاس پاشا کے جانشین سراج الدین کے صاحبزادے فواد نے دائر کر رکھا ہے اور دوسری درخواست یہاں کے چند مشکوک قسم کے لوگوں کی طرف سے حزبِ ناصری کے نام سے ایک نئی پارٹی تشکیل دینے کے لیے پیش کی گئی ہے یہاں کی ہائی کورٹ میں بھی ان لوگوں نے جمال عبدالناصر کے دور کے اس قانون کو چیلنج کر رکھا ہے جو ۱۹۵۱ء میں جاری کیا گیا تھا جس کی رُو سے تمام سیاسی جماعتیں ختم کی گئی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا جماعت اخوان المسلمون کی بحالی کا بھی امکان ہے؟ صلاح ابو اسماعیل صاحب ہنس کر کہنے لگے کہ اگر عدالت نے ۱۹۵۴ء والے قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا تو سب جماعتیں بحال ہو جائیں گی - البتہ اس امر کا قوی احتمال ہے کہ حکومت کوئی ایسی قانونی ترمیم جاری کر دے جس کی زد میں وفد پارٹی اور اخوان المسلمون دونوں آ جائیں اور انہیں بحال ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ (اب اخباری اطلاعات کے مطابق وفد پارٹی بحال کر دی گئی ہے مگر اخوان المسلمون کو بحال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی)

اخوان کی دعوت پھیل رہی ہے

صلاح ابو اسماعیل نے بتایا کہ گو اخوان المسلمون کے لوگوں کو جماعت بنانے اور جماعتی نام کے تحت کوئی سرگرمی دکھانے کی اجازت نہیں ہے، لیکن ان کی دعوت پھیل رہی ہے، جریدۃ الاحرار میں عمر التلمسانی صاحب بار بار مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں مصر کے کثیر الاشاعت اخبار الاہرام میں بھی عمر التلمسانی کے بعض مضامین چھپے ہیں۔

نمازیوں کے ہجوم میں نوجوانوں کی اکثریت

نماز جمعہ خاکسار نے مصر جدیدۃ کی ایک مسجد میں ادا کی - مسجد بڑی کشادہ ہے مگر حاضری اس قدر زیادہ ہے کہ اب اس کے اندر بیٹھنے کے لیے جگہ باقی نہیں ہے - لوگ باہر کھڑے ہیں، حاضرین کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے - عورتوں کے

لیے ایک الگ گوشے میں پردہ کا انتظام ہے۔ خطیب صاحب سیرۃ کے موضوع پر تقریر کر رہے ہیں۔ خطبہ اور نماز کے بعد خطیب صاحب پھر کھڑے ہو گئے اور عربی زبان میں بڑے ترنم سے ایک نعت شروع کر دی۔ حاضرین کو بھی اس کورس میں شریک کر لیا۔ دیر تک بڑے زور شور سے نعت خوانی ہوتی رہی۔ اسی انداز میں جیسے پاکستان کی بعض مساجد میں میلاد پڑھا جاتا ہے، مگر اکثر لوگ نماز ختم ہونے کے بعد چلے گئے تھے۔

معاشی بدحالی مسجد میں بعض واقف نوجوان مل گئے وہ اس امر پر اصرار کرنے لگے کہ میں اُن کے ساتھ گھر چلوں اور کھانا کھاؤں، لیکن میں زیادہ دیر تک ہوٹل سے باہر نہیں رہنا چاہتا تھا، اس لیے کہ کسی وقت بھی ایئر لائنز کی گاڑی ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہو سکتی ہے۔ ان کے ساتھ مختصر سی مجلس رہی۔ پہلے تو وہ مصر کی معاشی بدحالی کا رونا روتے رہے۔ اشیاء کی گرانی اور پھر کبھی کبھی ضروریاتِ زندگی کا بازار سے غائب ہو جانا۔ تنخواہ کی کمی، مکانوں کی قلت اور کرایوں کی کثرت اور بے روزگاری وغیرہ کے موضوع پر وہ دیر تک کلام کرتے رہے۔ مصر کی اقتصادی بدحالی کا آغاز جمال عبدالناصر کے دَورِ اشتراکیت سے ہوا ہے۔ اور ابھی تک مصر اس کے چنگل سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔

تحریکِ اسلامی اور نوجوان خاکسار نے دریافت کیا کہ اب یہاں اسلامی تحریک کا کیا حال ہے، بتانے لگے کہ نوجوان نسل کے اندر اسلام کی محبت —— اور پابندی روز بروز بڑھ رہی ہے، مگر کبھی کبھی حکومت ان نوجوانوں کا تعاقب شروع کر دیتی ہے تو یہ بھی دھیمے ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں حکومت کی طرف سے نوجوانوں کے اجتماعات منعقد کیے گئے۔ اور انہیں دل کھول کر اپنے خیالات بیان کرنے کا موقع دیا گیا۔ پھر انہی نوجوانوں کو خفیہ پولیس نے پریشان کیا۔ ان نوجوانوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخوان المسلمون کے ایک معمر رہنما جناب صالح العشماوی کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے میں بڑی کثرت سے لوگ شامل ہوتے۔ صالح العشماوی مرحوم امام حسن البنا کے ساتھیوں میں سے تھے۔ "الدعوۃ" اخبار انہوں نے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار کئی مرتبہ بند ہوا اور پھر جاری ہوتا رہا۔ انوار السادات کے دَور میں جب یہ از سرِ نو نکلنا شروع ہوا تو صالح العشماوی اس کے چیف ایڈیٹر تھے اور پیرانہ سالی

کے باوجود بڑے جذبہ انگیز ادب لکھتے رہے۔

ممنوع التنظیم نوجوان ان نوجوانوں نے یہ بھی بتایا کہ اس وقت نوجوانوں کی اسلامی تنظیمیں جو جماعاتِ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہیں، عملاً ممنوع ہیں، لیکن ذہن و فکر کی دنیا میں وہ برسرِ عمل ہیں۔ ان تنظیموں میں اکثر اخوان المسلمون کی موجودہ تصادم گریز پالیسی پہ چل رہی ہیں۔ اور چند ایک ایسی بھی ہیں جن میں بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ دراصل حکومت کے بعض ادارے خود اس امر کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ نوجوان مشتعل ہوں اور انہیں ضرب لگائی جائے۔

حکومت کی قبطی نوازیاں ان دوستوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت اب قبطی لیڈروں کو بھی اُبھار رہی ہے۔ ایک قبطی لیڈر انبا شنودہ جو "پوپ شنودہ سوم" کہلاتا ہے ابھی جیل میں ہے، مگر جیل سے اپنے ہم مذہبوں کے نام اس کے پیغامات اور احکام صادر ہو رہے ہیں۔ ان قبطیوں اور اسرائیلی یہودیوں کے مابین تعلقات بھی خوشگوار ہیں۔ ملک کے اندر جب اسلامی شریعت کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑتا ہے اور پارلیمنٹ اور دیگر قانونی ادارے حرکت میں آتے ہیں تو فوراً قبطی بھی میدان میں آجاتے ہیں۔ اور اسلامی قانون کے نفاذ کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔ حکومت ان کی مخالفت کو بہانہ بنا کر اسلامی قانون کے نفاذ کو ملتوی کر دیتی ہے۔ اب چونکہ پھر پارلیمنٹ کے اندر اور باہر یہ مطالبہ اٹھ رہا ہے اور علی الخصوص پڑوسی ملک سوڈان کے حالات نے مصری عوام کے جذبات کو بھی زندہ کر دیا ہے۔ اور ہر طرف اسلامی شریعت کے نفاذ کی باتیں ہونے لگی ہیں، اس لیے اب قبطیوں نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا ہے اور بعض سرکاری عناصر بھی ان کو حرکت میں لانے کے لیے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔

روانگی جہاز کا وقت گو چھ بجے شام تھا لیکن ایئرپورٹ والوں نے تین بجے ہی طلب کر لیا۔ یہ جہاز چونکہ قاہرہ سے کویت جا رہا ہے اور کویت میں دھماکوں کے بعد ایمرجنسی لگی ہوئی ہے اس لیے جہاز اور جہاز کے مسافروں کی سخت تفتیش ہو رہی ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

شوہر کے والدین کی خدمت

شعبہ استفسارات - منصورہ - لاہور

سوال :- ترجمان القرآن شمارہ ماہ فروری ۱۹۸۴ء میں ایک گھریلو اُلجھن کے عنوان سے رسائل و مسائل کے باب میں آپ کے بصیرت افروز جوابات پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ فقہی قوانین کی حد تک آپ نے جو مشورے اور احکام اس میں تجویز فرمائے ہیں - اور ایک بیوی کے حقوق کی جو نشان دہی کی ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔

لیکن میں ایک عام قاری ان جوابات کو پڑھ کر سخت پریشان ہو گیا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ اس طرح بوڑھے والدین کا مقام گھر میں نہیں بلکہ مغربی ممالک کی طرح ایسا الگ تھلگ مقام ہونا چاہیے جہاں اُن کو پھینک دیا جائے اور اگر توفیق ہو تو کچھ پیسے وغیرہ دے کر ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا ہے۔

یہ بجا کہ قانونی طور پر ایک بیوی خاوند کے والدین کی پابند نہیں ہے اور یہ ذمہ داری براہ راست مرد کی ہے، لیکن کیا اگر والدین بوڑھے ہو جائیں - بیمار بھی ہوں، اُن کا الگ سے کوئی ذریعۂ آمدن بھی نہ ہو، ان کا بیٹا اتنا خوش حال بھی نہ ہو کہ اُن کو الگ سے کوئی رہائش لے کر دے اور اُن کی خدمت کے لیے خادم کا بندوبست کر سکے تو پھر اس صورت میں کیا اُسے بیوی کے قانونی حقوق کی حفاظت کے لیے الگ سے خیمہ لگا لینا چاہیے اور بوڑھے والدین کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے - یا اُن کو اپنے پاس رکھ کر اُن کی خدمت کرے - لیکن خدمت کیسے

مغربی خواتین کی تحریک کے بارے میں یہاں کے لوگوں کو زیادہ علم نہیں اور اپنی بے علمی کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی عورت صرف جنسی آزادی چاہتی ہے۔ حقیقت میں یہ بات بالکل غلط ہے۔ انہوں نے کہا کہ آسٹریلیا میں گھرداری اور بچوں کی پرورش کی ذمہ داریوں کو عورتوں تک محدود کرنے کے بجائے عورتوں اور مردوں پر برابر تقسیم کیا جاتا ہے[1]

(جنگ لاہور - ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء)

انڈسٹریل ایریا گلبرگ یوم مئی کے سلسلے میں آج رات انڈسٹریل ایریا گلبرگ میں خواتین مجلسِ عمل، ویمن ایکشن فورم اور آل پاکستان ٹریڈ یونین کی جانب سے ایک ثقافتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام میں متعدد صنعت کاروں، سرکاری افسروں اور وکلا کے علاوہ معروف شخصیات کی بیگمات، بیٹوں اور بیٹیوں نے شرکت کی۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں لوک گیت پیش کیے گئے جنہیں لڑکوں اور لڑکیوں نے مل کر گایا۔ پھر انہوں نے مل کر ۳ ڈرامے ڈرامے پیش کئے۔ آخر میں لڑکیوں اور لڑکوں نے موسیقی کی دھنوں پر ڈانس کیا اور "دھمال" ڈالی۔ مخلوط ناچ کا یہ سلسلہ ۱۵ منٹ جاری رہا۔ وہ اس دوران میں "سوشلزم آوے ای آوے" کے نعرے بلند کرتے رہے۔ (نوائے وقت لاہور - ۳ مئی ۱۹۸۳ء)

سیٹھ کے لڑکے کی شادی کشمور میں ایک سیٹھ کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شراب اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اخلاق باختہ معاشروں کی خواتین کو بلا کر ان سے وعظ سنتی ہیں اور زندگی کے طور طریقے سیکھتی ہیں۔ مقام عبرت ہے۔ کاش کہ تہذیبِ جدیدہ سے بغاوت کرنے والی خواتین اور طالبات ایک کثیر تعداد میں اُٹھ کھڑی ہوں اور تہذیب الحاد کی مبلغات سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہمارے عقائد، نظامِ حیات اور تصورِ نسائیت تم سے اتنا مختلف ہے کہ اسلامی تصورات اور مغربی تصورات میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔

[1] فطرت کی اس عدم مساوات کا کیا علاج کہ بچے جننے اور اُن کو دودھ پلانے میں مرد برابر کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔

اس طرح کے گھروں میں نہ صرف یہ کہ بہت بڑی خرابیوں کے چور دروازے کھل جاتے ہیں (اور عملاً لوگوں کو پیچیدگیاں درپیش ہیں) بلکہ ساسوں، نندوں کا بالعموم جو رویّہ ہمارے یہاں پایا جاتا ہے اس کی وجہ سے لڑکیاں چند دن اپنا جذبۂ خدمت دکھا کر مایوس اور بددل ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات کو درست کرنے کے لیے مختلف اطراف سے اصلاح کی ضرورت ہے۔ ایک لڑکی جب یہ کہتی ہے کہ میں تنہائی محسوس کرتی ہوں اور مجھے طعن و تشنیع سننے پڑتے ہیں تو آپ پہلے اس کا علاج ڈھونڈیے اور پھر خدمت کی بات چھیڑیے۔ معاشرے کی خرابیاں یک طرفہ نہیں ہیں۔ ان کے کئی پہلو ہیں۔ ایک پہلو ہم نے بیان کیا، دوسرا آپ نے۔ اب یہ تو اصل شرکائے معاملہ کا فرض ہے کہ وہ تمام ضرورتوں میں توازن پیدا کریں۔ یہ چیزیں فتووں سے حل نہیں ہو سکتیں، طرزِ عمل بدلنے سے حل ہو سکتی ہیں۔ (ف ر ص)

ازدواجی اور معاشرتی زندگی کے چند پہلو

سوال:-

۱- ا- چٹیا یا جوڑا بندھا ہوا تھا، فجر کو غسلِ واجب کے لیے بالوں کی جڑوں کو گیلا کیا، کچھ دیر بعد کنگھی کر کے بال سکھانے کے لیے جوڑا کھول دیا۔ کیا یہ درست ہے؟

ب- عادت کے مطابق جوڑا بندھا تھا۔ سوتے میں کھل گیا، صبح اسے باندھ کر غسلِ واجب کے لیے جڑیں گیلی کی جا سکتی ہیں، یا اگر بال کھلے رہے ہوں تو جڑوں کے علاوہ ہر بال کو پوری لمبائی تک گیلا کرنا ضروری ہے؟ بسا اوقات سردی کی وجہ سے سر درد یا کچھ اور تکلیف ہو جاتی ہے، یا گیلے کیے ہوئے بال اگلی رات تک جا کر سوکھتے ہیں۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ اوپر سے سر اور بالوں کی جڑیں گیلی کر لی جائیں اور پشت پہ لمبے بال نہ گیلے کیے جائیں؟

واضح رہے کہ جوڑے سے میری مراد وہ فیشنی جوڑا نہیں جسے اونچا کر کے باندھا

جاتا ہے بلکہ سہولت کے لیے بالوں کو کوئی پن وغیرہ استعمال کیے بغیر اکٹھا کر لیا جاتا ہے ؟

۲۔ ایک شخص جو دین کا فہم اور جماعت اسلامی (کالعدم) سے تعلق رکھتا ہے، اس کے اندر نفسانی خواہش اتنی زیادہ ہے کہ شادی سے چند سال بعد تک بلاناغہ دن میں دو تین بار متوجہ ہوتا رہا ہے۔ دس بارہ سال گزرنے پر بھی اکثر بلاناغہ (ناغہ ہو تو شدید مجبوری سے!) روزانہ یہی مشغلہ رہتا ہے۔ اس معاملے میں نہ بیوی کی علالت یا تھکن کا لحاظ، نہ بچوں کی علالت اور ان کی تیمارداری میں شب بیداری کا لحاظ، نہ سفر اور مہمانداری یا میزبانی کا لحاظ۔ نہ یہ خیال کہ مجھے سردی میں صبح کو غسل کرنے میں تکلیف ہوگی، اور کبھی اگر اس رجحان میں کمی ہونے لگے تو دواؤں کا استعمال!

ساتھ ہی سخت مزاجی اور غصیلی طبیعت کی وجہ سے، محبت کے باوجود زندگی گزارنا دوبھر ہو جاتا ہے۔

اسلامی طریق پر اپنے مزاج کو اعتدال میں رکھنے کے لیے نہ کبھی نفل روزہ نہ رکھنا اور نہ نفل نمازیں ادا کرنا۔ اُدھر یہ حال کہ فہم دین بھی اتنا ہے کہ آنجناب مشہور داعی اور مبلغ بھی ہیں۔

۳۔ بیوی سخت پردے کا اہتمام کرتی ہے، گھر میں بھی اور باہر نکلتے ہوئے بھی دونوں فریق دین کا شعور رکھتے ہیں اور داعیٔ حق ہیں۔ اب جو رشتہ دار اور دوسری خواتین مرد کے سامنے آتی ہیں، وہ پردہ نہیں کرتیں۔ ایسی حالت میں مرد کا کیا رویہ ہونا چاہیے کیا مرد کو جواباً (اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ خواتین گھر میں اکیلی نہ ہوں) ان سے براہ راست خیر خیریت دریافت کرنی چاہیے؟ عملاً صورت یہ ہے کہ خیریت دریافت کرنے کے نقطۂ آغاز سے آگے بات ہنسی مذاق اور غیبت تک پہنچتی ہے۔ فطری حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات مرد ایک نگاہ ڈالتے ہی عورت کے کپڑوں کے رنگ، انداز، فیشن، میک اپ بلکہ جسمانی اعضا کی ساخت تک کو بھانپ لیتا ہے۔ کیا مرد کو اس طرح رشتہ دار اور دیگر خواتین سے ـــــــ میل جول رکھنا ٹھیک ہے۔ ساتھ ہی رسمیات

بے تحت مرد کو یہ ڈر بھی رہتا ہے کہ اندر جا کر حال نہ پوچھا تو خواتین بُرا منائیں گی۔ کیا یہ مناسب نہیں گھر کے بچوں کے ہاتھ سلام بھجوا کر خیریت پوچھ لی جائے؟

ہمارے شوہر صاحب کا ایک داعی ہونے کے باوجود یہ حال ہے کہ جماہی منہ پھاڑ کر لینے اور حلق سے آواز نکالنے پر اگر یاد دلایا جائے کہ اس معاملے میں حضورؐ کی سنت یہ ہے تو فوراً یہ جواب کہ میں نے ایسا کب کیا ہے؟ کیا ستم ہے کہ دینی لٹریچر سے وعظ و تبلیغ کے لیے مناسب باتیں اخذ تو کر لی جائیں مگر اپنی حقیقی خانگی زندگی میں مومنانہ اخلاق، مسنون آداب اور ماثورہ اذکار اور دعاؤں کو عملاً نہ برتا جائے

براہ کرم میرا خط میرے نام اور شہر کے ذکر کے بغیر مختصر کر کے ترجمان القرآن میں دیا جائے۔

جواب :- ۱ - ا ، ب

محترم جناب مولانا نعیم صدیقی صاحب کے نام آپ کا خط انہیں موصول ہوا۔ آپ کے اہم سوالوں کا جواب انہوں نے تحریر فرما دیا ہے۔ غسل کے متعلق سوال کا جواب درج ذیل ہے:-

۱۔ عورت کو یہ رعایت دی گئی ہے کہ اس کے بال گندھے ہوئے ہوں تو بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچا دے اس کا غسل ہو جائے گا، لیکن بال کھلے ہوں تو پھر بالوں کے درمیان بھی پانی پہنچانا ہو گا۔

"ولیس علی المرأة ان تنقض ضفائرها فی الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر ولیس علیها بل ذوائبها هو الصحیح کذا فی الهدایه، ولو کان شعر المرأة منقوضا یجب ایصال الماء الی اثنائه" (عالمگیری ج ۱ ص ۱۳)

(عورت پر لازم نہیں ہے کہ وہ غسل میں اپنی مینڈیاں کھول دے جب کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچتا ہو، اس پر زلفوں کا تر کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔ یہی بات صحیح ہے ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ اور اگر بال کھلے ہوں تو پانی ان کے درمیان پہنچانا بھی ضروری ہے)

مولانا عبدالمالک صاحب ناظم شعبہ استفسارات

جواب ۲

آپ کے سوالات کے جوابات ترتیب کے بغیر دے رہا ہوں۔ مرد اور عورت کا تعلق رفاقت اور راہِ حیات پر ہم سفری کا ہے۔ جس طرح ایک مسافر دوسرے کا خیال رکھتا ہے، یا جس طرح ایک رفیق یا دوست کو دوسرے کی فکر ہوتی ہے، اسی طرح شوہر کو بیوی اور بیوی کو شوہر کے ساتھ رویہ رکھنا چاہیے۔

حد سے بڑھا ہوا جنسی رجحان بعض لوگوں میں وراثتاً اور بچپن کے بعض محرکات کے تحت پیدا ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے بعض لوگوں کا غصہ بہت سخت ہوتا ہے اور جلد آتا ہے۔ بعض لوگ مایوسی کا جلد شکار ہو جاتے ہیں، غرضیکہ مختلف حالات میں پرورش پاکر مختلف میلانات کی تیزی و تندی کے ساتھ لوگ اُبھرتے ہیں۔ اسی قسم کے حد سے بڑھے ہوئے جنسی جذبات رکھنے والوں کے لیے ایک سے زیادہ شادیوں کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو بیوی کی صحت، تھکن، بیماری، اکتاہٹ، مہمان داری کے مواقع کا لحاظ رکھنے کے لیے نفس کی تربیت کرنی چاہیے۔ نہ یہ کہ آدمی پر ہمہ وقت ایک ہی جنون سوار رہے۔ اگر کسی شخص نے خدا کا دین اپنے لیے سمجھا ہو، نہ کہ وعظ اور لیڈری کے لیے تو وہ فریقِ ثانی کی تکلیف کا احساس کرتا ہے۔ یہ مشکل ہو تو قرآن پڑھ کر، نوافل ادا کر کے، روزے رکھ کر اپنے آپ کو اعتدال پر لاتا ہے۔

رہے وہ لوگ جو اس طرح کی بے اعتدالی میں عمر گزارتے ہیں اور پھر دواؤں سے اس آگ کو مزید بھڑکاتے ہیں (حالانکہ ٹھنڈا رکھنے والی دوائیں بھی موجود ہیں) وہ بعد کی عمر میں بہت بُرے نتائج بھگتتے ہیں۔

جو لوگ اپنے گھروں میں بیویوں کے ساتھ اچھی زندگی نہ گزار سکیں اور جماع اور چھینک تک لینے کے اسلامی آداب سے واقف نہ ہوں، ان کی تبلیغ و وعظ کی مساعی ایک اچھا ڈرامہ ہوتی ہیں۔ حضورؐ کا فرمان ہے۔ خیرکم خیرکم لاھلہ۔

ایسے حالات میں آپ کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک وہ جس کی سفارش میں نہیں کر سکتا۔ وہ مصیبت سے نجات پانے کے لیے خلع کا حصول ہے۔ یہ انتہائی مجبوری کا راستہ ہے۔ دوسری صورت وہی ہے جو آپ نے لکھی ہے کہ صبر سے یہ سمجھ کر کام لیں کہ جس طرح بچے غرکاروں کے

قبضے میں آکر سارے بے گناہ لوگ پولیس کی ماریں کھا کھا کر چار و ناچار اپنا وقت گزارتے ہیں۔ آپ بھی خدا سے دعا اور فریاد کرتے ہوئے وقت گزاریں۔ اور اپنے لیے بھی اور شوہر کے لیے فلاح و سعادت اور ہدایت اللہ تعالیٰ سے مانگیں۔

رشتہ دار یا آنے جانے والی خواتین سے مردوں کا کوئی کام نہیں۔ شریعت سے صرف اس حد تک غیر محرم اقربا کے بارے میں رعایت نکل سکتی ہے کہ مرد اگر ان کے کمرے کی طرف جائیں تو نگاہیں نیچی کر کے دو منٹ میں سلام و خیریت کی بات کر کے الگ ہو جائیں۔ عورتیں بھی رشتہ دار مردوں کے سامنے جسم کو چھپا کر جھکی نظروں کے ساتھ سادہ لہجے میں کوئی خیر خبر دریافت کر لیں یا ان کے سامنے چائے وغیرہ رکھ دیں۔ ہو سکے تو بچوں سے زیادہ کام لیا جائے۔ اس سے بڑھ کر جو رسمیں ہیں۔ [illegible] بیچ میں وہ شرعی احکام کو نہ جاننے کی وجہ سے ہیں۔ ہنسی مذاق کرنا اور بیٹھ کر لمبی چوڑی بے تکلفی کی باتیں کرنا درست نہیں ہے۔ بعض علاقوں میں نہایت غلط روایات قائم ہیں ان کو آہستہ آہستہ سمجھانے کی ضرورت ہے۔

تحریکی یا اسلامی لٹریچر سے وعظ و تقریر کے لیے باتیں چھانٹنا اور اپنی زندگی میں جاری و ساری کرنے کے لیے احکام و آداب کی طرف متوجہ نہ ہونا ایک مذاق ہے۔ یہ ڈرامائی عمل ہے۔ اور بہت سے لوگ ایسے ہی ڈرامائی عمل سے زندگی گزار دیتے ہیں۔ ایسے جو لوگ جماعت کے اندر ہیں، وہ درحقیقت تحریک کی کمزوری کا باعث ہیں۔ یہ کام تو مخلص لوگوں کے کرنے کا ہے۔

(نعیم صدیقی)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)

مطبوعات

AGRICULTURAL EXTENSION IN ISLAMIC CULTURAL MILIEU

مؤلف: جناب مظفر حسین ڈائریکٹر ایگریکلچرل انفارمیشن (پنجاب)
ناشر: نیشنل سائنس کونسل ۲۷ اسکول روڈ — F-6/2 اسلام آباد
پاکستان۔ قیمت نامعلوم۔

علمی تحقیقی سطح کی اس شاندار کتاب کا ہم اس کی خوبصورت انگریزی زبان، اس کے حسنِ طباعت و جلد بندی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ دنیا میں تحریکِ اسلامی کی جو روپیل رہی ہے، وہ اب دعوتِ عام کے ابتدائی مرحلے سے آگے نکل کر جہاں پہلے ادب اور نصابی کتب میں نمودار ہوئی۔ وہاں اب مختلف ممالک کے دانشور اسے خالص علمی اور تحقیقی سطح پر اجاگر کر کے علوم کی تشکیل کا آغاز کر چکے ہیں۔ یہ کتاب اسی بلند سطح سے تعلق رکھتی ہے۔

مظفر حسین صاحب کے علمی مرتبہ اور ڈگریوں کو الگ رکھتے ہوئے میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ اسلامی قلب و دماغ کے ساتھ سائنس کے مختلف دائروں میں عمر بھر مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ محض تحقیق کے بجائے افکار کی تشکیلِ نو کا کام ان کی طرح کرنے والے ہمارے حلقے میں کم لوگ آئے ہیں۔

اپنی شدید مصروفیات کے باوجود میں نے متواتر تین دن صرف کر کے اس کتاب کا تقریباً ایک ایک پیراگراف پڑھ ڈالا ہے، اور جتنے نشان میں نے اس کتاب کے اہم مباحث پر لگائے ہیں، وہ ۱۴ سلیپوں پر اشارات لکھے ہیں، اگر اس ساری محنت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے تبصرہ لکھنا چاہوں تو وہ ایک ضخیم مقالہ ہوگا۔ مصنف کو تو شکایت ہوگی ہی کہ میرا اپنا حال بھی قابلِ رحم ہے کہ دماغ

ہیں ایک انبارِ خیالات جمع کرنے کے بعد اب صرف چند الفاظ لکھ کر اپنے تاثرات کا خاکہ اُڑا دینے لگا ہوں۔

کتھیدی سطور میں بات ریاض یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ماہرین سائنس کی کانفرنس میں پڑھے جانے والے اس مقالے سے چلی جس میں مظفر صاحب کی پیش کردہ ۳۴ نکات میں سے طے شدہ سفارشات ۳ پر مبنی تھیں۔ آگے پھر مضمون در مضمون کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔

ساری کتاب کا اگر میں خلاصہ بیان کروں تو وہ یہ ہے کہ "ایگریکلچر" کی توسیع و ترقی "کلچر" کے بغیر اور "سٹائل" (soul) کی بہتری سول (soul) کے بغیر اور ٹیکنالوجی کی افادیت آئیڈیالوجی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر اتنی سی بات کو فلسفیانہ انداز سے علمی سطح پہ بیان اور ثابت کرنے کے لیے مظفر حسین صاحب نے نہ صرف یہ کہ قرآن اور حدیث کے استدلالات کو اپنے مآخذ پر جمع کیا ہے بلکہ مادہ پرست مغرب کے معروف دانشوروں کے حوالے اپنی تائید میں اس کثرت سے بہم کیے ہیں کہ سطر سطر ان کی وسعتِ مطالعہ کی شہادت دیتی ہے۔

مظفر صاحب کا خلاصۂ مدعا یہ ہے کہ زرعی (یا معاشی) ترقی کو پورے معاشرے کے مخصوص تہذیبی و تمدنی انداز سے الگ کر کے ایک جداگانہ خلنے میں جامۂ عمل نہیں پہنایا جا سکتا۔ اسی طرح مختلف علوم کے بکھرے ہوئے پارچوں سے اس وقت تک پورا استفادہ نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک کہ انہیں کسی آئیڈیالوجی اور کلچر یا عقیدے اور تہذیبی دعوت کے تحت جمع اور منظم نہ کیا جائے۔ کتاب اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ علوم اور سرمایہ اور وسائل سب کے مقابلے میں ترقی و توسیع —— زرعی یا اقتصادی —— کا اہم ترین عنصر انسان ہے اگر انسان میں کسی وحدتِ مقصد اور کسی شعورِ تہذیب کے ذریعے اخلاقی تحریک نہ اُبھاری جا سکے، بقیہ عوامل پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک غیر نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

پھر وہ جدید منکرِ خدا مادّہ پرستانہ تمدن اور اس کے تحت ہونے والی زرعی کوششوں اور اقتصادی ترقیوں کی مختلف کمزوریوں اور کوتاہیوں پر خود اُدھر ہی کے اصحابِ فکر و شعور کی گواہیاں سامنے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں تورات اور بائیبل نے انسانوں کی زرعی زندگی سے تعرض کرتے ہیں جو کمی چھوڑی ہے، اُسے واضح کرنے کے لیے وہ قرآن (نیز حدیث)

کی حکمت کو بڑے زور سے (واعظانہ اور صحافیانہ رنگ میں نہیں بلکہ فلسفیانہ اور محققانہ انداز سے) پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اسلامی کلچر کے بنیادی عقیدہ توحید سے لے کر وحی اور آخرت اور نیکی اور بدی سب کے لیے زرعی زندگی ہی سے مثالیں لی گئی ہیں (حتی کہ بالکل اساسی تصور دین کو واضح کرنے کے لیے شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ کی تمثیلات بیان ہوتی ہیں)۔ قرآن میں باغوں، پانی کے بندوں، نہروں، بارش اور پھلوں اور مویشیوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ بائیبل اور تورات کے تصورات کے خلاف قرآنی نظریہ یہ ہے کہ آدم کے دور ہی سے زراعت کاری کا آغاز ہوا۔ اور بعد میں متعدد انبیاء کی مثالیں دی ہیں جو کاشت کاری کرتے تھے یا مویشیوں اور بھیڑ بکریوں کی پرورش کا مشغلہ رکھتے تھے۔ اس سے خود آنحضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی بھی مستثنیٰ نہیں۔

صاحب کتاب نے بڑی اہم بات یہ کہی ہے کہ اگر اسلامی کلچر اپنے مرکزی کلمہ (کلمہ طیبہ) پر کھڑا ہو اور زندگیاں اس کے رنگ میں رنگی ہوں تو اس کے تحت زراعت کار اور کسی بھی طرح کا کام کرنے والا شخص نیکی اور صدقہ کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ سارے کام اسی طرح دین کے تحت آتے ہیں جیسے نوافل یا مسکین نوازی یا دوسری نیکیاں۔ پس زراعت کی توسیع یا اقتصادی ترقی یا اس سلسلے میں نئی ٹیکنالوجی کا استعمال ایک مسلم کو اس شعور سے کرنے کی تعلیم دینی چاہیے کہ وہ اپنے لیے، اپنے لواحقین اور حقداروں کے لیے اور آگے ساری انسانیت کے لیے ایک ایسی خدمت انجام دے رہا ہے جس کا سارا پھل اسے دنیا ہی میں نہیں اٹھا لینا ہے، بلکہ وہ بڑے بڑے انبار آخرت کے کھلیان میں جمع کر رہا ہے۔

اسی سلسلے میں فاضل مؤلف نے ایک باب میں بہت اہم بحث حرکت انگیزی (MOTIVATION) کی چھیڑی ہے یعنی محض زرعی یا ٹیکنالوجیکل علوم کو زراعت کار تک منتقل کر دینے سے کام نہ چلے گا۔ بلکہ اس مہم میں حرکت انگیزی کا اہتمام کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں علوم یا وسائل آدمی کے باہر واقع ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود آدمی کے اندر کی قوتیں کام کریں اور اسی حقیقت کا خلاصہ اقبال کے ان الفاظ میں بڑی خوبی سے افتتاحیہ (PROLOGUE) میں بیان ہو گیا ہے کہ "اگر ہم چاہتے ہیں کہ اچھے مزدور، اچھے دکاندار اور اچھے صناع اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کریں تو ہمیں پہلے اچھے مسلم پیدا کرنے چاہئیں۔

صرف ایک مقام پر میں اُلجھا ہوں۔ صفحہ نمبر ۱۹ پر مؤلف نے بیان کیا ہے کہ مدینہ میں باقاعدہ زرعی تعلیم ہوتی تھی ——— کبھی کلاسیں روزانہ لی جاتیں اور کبھی ہفتہ وار، بعض ششماہی بنیاد پر منظم کی جاتیں۔ اس کے بعد کا یہ بیان درست ہے کہ مسلمانوں کا دَورِ عروج زرعی لحاظ سے بھی دنیا بھر میں بلند سطح پر پہنچ گیا تھا۔ یہاں تک بہت سی اجناس کی کاشت مسلمانوں ہی نے مغرب کو سکھائی۔ پہلے جملے کی حیثیت یہ تو ہو سکتی ہے کہ حدیث و سیر کے متعدد حوالوں سے اخذ کر کے ایک مکمل سسٹم کا تصور حاصل کر لیا گیا ہو، مگر میرے ناقص اور محدود مطالعہ کے لحاظ سے اس طرح کی صورتِ حالات واضح طور پر ثابت نہیں ہے۔

دوسری ایک چیز جو اگرچہ اس طرح بیان ہو گئی ہے کہ زرعی توسیع یا اقتصادی ترقی کے لیے اجتماعی رویّہ ایسا پیدا ہونا چاہیے کہ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک نیکی کر رہا ہے اور خدمت انجام دے رہا ہے، اگر مؤلف کی کتاب میں عقیدہ اور کلچر کے ساتھ محض حرکت کی ضرورت کا ذکر آتا ہے۔ لیکن ایک ایسی نظریاتی یا کلچرل تحریک کا ذکر نہیں آیا جس کے تحت ہر شخص جس بھی درجے پر جس بھی کام کو انجام دے رہا ہے، یہ سمجھے کہ وہ کشمکش کی اس دنیا میں لڑ کر اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے کارخانے یا دفتر یا تعلیم گاہ یا تھانے یا اسمبلی یا کھیت میں مصروف ہے۔ وہ ایک اجتماعی جہاد کا سپاہی ہے اور اس کے حصے میں جو فریضہ آیا ہے اُسے وہ اس جذبے سے ادا کرنے کا پابند ہے کہ ممکن ہے کہ اس کی کوتاہی سے ساری بازی ہر جائے۔ جنگی لحاظ سے دشمنوں کے درمیان، اخلاقی لحاظ سے درندہ صفت مجرموں کے درمیان اور نظریاتی و تہذیبی لحاظ سے یلغار کرتے ہوئے سیلِ بلا کے تھپیڑوں کے درمیان کوئی سا فریضہ ادا کرتے ہوئے بھی اسے احساس ہونا چاہیے کہ وہ ایک خوفناک میدانِ جنگ میں کھڑا جانباز ہے جس کے خوشے کا ہر دانہ اور جس کے قلم کا ہر نقطہ اور جس کی کمائی کا ہر سکہ معاند قوتوں سے عہدہ برآ ہونے کا ذریعہ ہے۔

مگر شاید زراعت کے موضوع پر فلسفیانہ مقالہ لکھنے والا کوئی مؤلف اس طرح کی بات مشکل ہی سے سوچ سکتا ہے اور مزید مشکل سے وہ اسے اپنے مباحث میں کھپا سکتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سطح کی اس کتاب کے فلسفے کو دیہاتی کسانوں تک پہنچانے اور جامۂ عمل پہنانے کے لیے ہمارے ذرائع ابلاغ اس کتاب کے مقصد میں اپنا حصہ ادا کر سکیں گے یا نہیں!

کھلی چٹھی بنام قاضی مظہر حسین من جانب: سید مہر حسین بخاری - ناشر: مجلس تحفظِ ناموسِ اہل بیت - قیمت ۲/- روپے

اصل حقیقت پورا نام: قاضی مظہر حسین چکوالی کے خارجی فتنہ کی اصل حقیقت
از مولانا محمد علی صاحب سعد آبادی - ناشر: تحریک خدام الصحابہؓ، شریف نگر، سی ۶ - فیڈرل بی ایریا کراچی۔

یہ دو رسائل تبصرے کے لیے آئے ہیں، مگر ان صفحات میں ایسی بحثوں پر کیا تبصرہ لکھا جائے جو ہماری توجہات کو حال کے تباہ کن فتنۂ الحاد اور فلسفہ ہائے مادیت سے ہٹا کر بار بار کی دہرائی ہوئی صدیوں پہلے کی تاریخ پر لے جاتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا معاملہ کیسا تھا۔

یوں بھی جہاں تک (بواسطہ ہم علاقائیت) میں جملاً قاضی مظہر حسین صاحب کو جانتا ہوں، بغیر ان کے ادب میں کمی کیے، انہیں "مظہر مباحث" سمجھتا ہوں۔ وہ سالہا سال سے نت نئے قضیے چھیڑتے رہتے ہیں اور اسی میں ان کا علم اور ان کی عزیز عمر کھپ رہی ہے۔ قاضی صاحب کے لیے یہ ہی کافی تھے کہ وہ سارے نادر اندازیاں ہم پر شوق سے کرتے رہتے۔ کیا کہ وہ طرح طرح کے مناظروں اور قضیوں کو اٹھاتے رہتے ہیں۔ کیا ان کی کوششوں سے علاقہ میں دس بیس افراد بھی کھرے مسلمان بن سکے؟ رشوت، مالِ حرام، تشدد، اسراف، برادری پرستی، رسم پرستی، شرک اور دوسری بلاؤں میں کچھ بھی کمی آئی۔ یہی معیار ہوتا ہے دینِ برحق کی علمبرداری میں کامیابی کا۔

اسی طرح ان کے خلاف جو اصحاب لکھتے ہیں کہ میں ان سے کہتا ہوں کہ آؤ اور آج کی سپر پاورز کی سامراجیت اور آج کے فلسفوں اور آج کی تہذیبی قدروں کے تباہ کن سیلاب کو دیکھو کہ مسلمان خاص طور پر اس کی زد میں آکر تباہ ہو رہے ہیں، کچھ ان کا توڑ کرو اور مسلمانوں کو اس سیلاب کے شعور

کے ساتھ اس کے خلاف کھڑا ہونے کے قابل بناؤ - اوپر جن دو رسائل کا نام لکھا گیا ہے وہ ہمارے ایمان و اخلاق اور ہمارے سیاسی و معاشی رویوں اور ہمارے بین الاقوامی اقدامات میں کچھ بھی مدد نہیں دیتے -

بس اس کے سوا ان پر کچھ اور تبصرہ کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا - مناظرہ بازانہ بحثوں سے ہمارے اندر دلچسپی پائی ہی نہیں جاتی -

---

ترجمۃ القرآن الکریم پارہ اوّل | از عبید اللہ عبید - ناشر: ادارہ تعلیم عربی گوجرانوالہ

ملنے کا پتہ: ادارہ خدمتِ خلق - جی - ٹی روڈ - گوجرانوالہ -

اس ترجمے کا انداز یہ ہے کہ آیت کے نیچے لفظوں کا لفظی ترجمہ پہلے لکھا گیا ہے، پھر بامحاورہ عبارت ہے، زبان سلیس، مگر طباعت گھٹیا ہے، البتہ ٹائیٹل آرٹ پیپر کا -

---

خصوصی معذرت

رسالہ کی ترتیب کی تکمیل کرتے ہوئے تبصرۂ کتب کا دائرہ محدود کرنا پڑا اور حکمتِ سید مودودیؒ بھی شامل نہیں ہے - نیز محترمی اسعد گیلانی صاحب کا کتابت شدہ مضمون "ملی یکجہتی کی بنیادیں" شامل نہ کیا جا سکا - متعلقہ رفقاء احباب درگزر فرمائیں - (ادارہ)

تفہیم القرآن

جلد پنجم

جو کہ ایک عرصے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب دوبارہ چھپ

چکی ہے۔ قارئین کرام اپنے آرڈر پیشگی بک کرا سکتے ہیں۔

ادارہ

ترجمان القرآن لمیٹڈ

دربار مارکیٹ (میلارام)، لاہور

مئی ۱۹۸۴ء
رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

قوموں کے تباہ کن مسائل کا واحد حل اسلامی انقلاب ہے

کیا ایران کا انقلاب بھی

اسلامی انقلاب ہی ہے؟

عالم اسلام میں یہ سوال بڑے پیمانے پر زیر بحث ہے !
عالم کفر کا ہر گروہ اسکی مخالفت میں یکسو اور کمربستہ ہے!!
طاغوتی انقلاب کو اسلامی انقلاب کہنا جتنی بڑی گمراہی ہے اس سے بڑی بدنصیبی اسلامی انقلاب کی مخالفت میں ہے، تو کیا ایران کا اسلامی انقلاب عالم اسلام کے اسلامی انقلابات کا پیش خیمہ اور ہراول دستہ ہے!!!

یہ ساری باتیں

یہ ساری باتیں

سفر نامۂ ایران



میں

سید اسعد گیلانی

زیر بحث لاتے ہیں

○ احساسات ○ سفرنامہ ○ شذرات ○ تأثرات

کے عنوانات کے تحت پچاس سے زائد موضوعات پر بحث کی گئی ہے

سائز $\frac{۲۳\times۳۶}{۱۶}$ ضخامت ۲۷۴ صفحات

قیمت ڈیلکس ایڈیشن -/۳۰ روپے

اسلامی اکادمی ۲۰/ج **منصورہ**
ملتان روڈ لاہور